ملک صفدر حیات (سیریز نمبر 17)
بے لگام
(تحریر حسام بٹ)
ناول بشکریہ : سلمان سلیم
عقیل قریشی ۔ یاسر حسین
ناصر بلوچ ۔ صائم بھائی
سسپنس ڈائجسٹ : فروری 2020
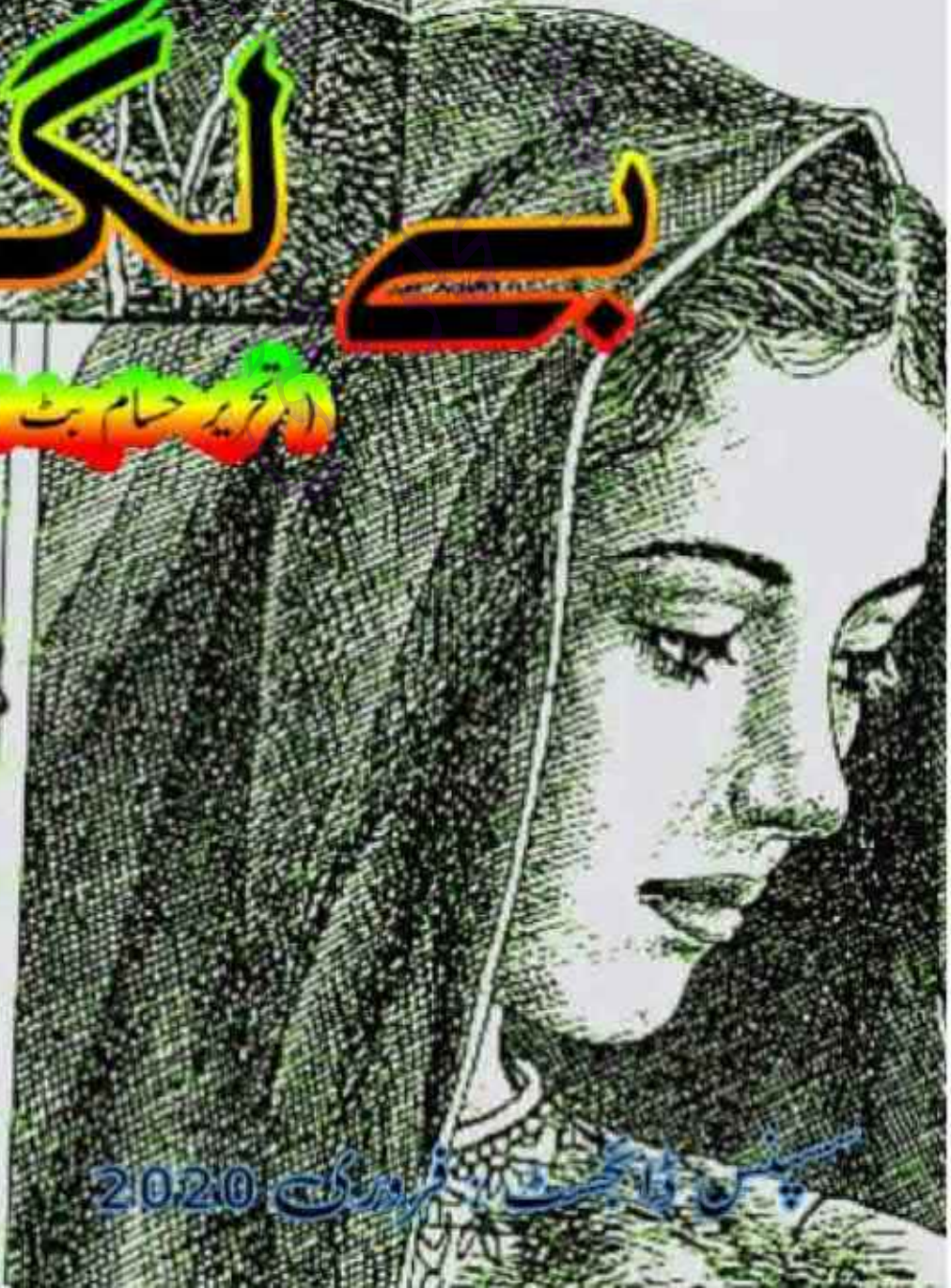
بے لگام

ملک صفدر حیات

اولاد کے بارے میں بے شمار معاملے اور مختلف تجربات لوگوں کی رہنمائی کے لیے ہر وقت کہیں نہ کہیں مل جاتے ہیں۔ البتہ سمجھنے والوں کی عقل پر پردے پڑ جاتے ہیں کیونکہ جس نے ٹھوکر کھانی ہو قدرت بھی اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی ہے اور پھر سونے کا نوالہ کھلا کر شیر کی نگاہ سے دیکھنے کے بجائے اولاد کو مزید ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھنے والے عموماً چھالوں کی تکلیف سے بلبلا جاتے ہیں... ایسے ہی اسے اذیت کو سہنا پڑا جب اس کی اولاد اس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا سبب بنی... بہرحال ملک صفدر کو بھی آنکھوں سے تمام دھول نکالنے کا بہت تجربہ تھا جو یہاں اس وقت بہت کام آیا۔

اگر اولاد نافرمان اور خودسر نکل آئے تو عموماً یہ کہتے ہوئے ماں کو الزام دیا جاتا ہے...... ''تمہارے لاڈ پیار اور بے جا حمایت نے اسے بگاڑا ہے۔'' لیکن میرا تجربہ یہ ہے کہ محبتِ مادر کی بہ نسبت حد سے متجاوز شفقتِ پدری زیادہ مہلک اور تباہ کن نتائج لاتی ہے۔ اس حوالے سے بگڑنے والے بچے جو گل کھلاتے ہیں ان میں پتیاں کم اور کانٹے زیادہ ہوتے ہیں اور...... بے لگام گھوڑا ہو یا انسان، وہ ہر حال میں اذیت رساں اور نقصان دہ ہی ثابت ہوتا ہے۔

وہ موسم سرما کا الوداعی زمانہ تھا۔ فروری کا مہینا قریب الختم تھا۔ ایک خنک شام میں تھانے سے اٹھنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ چار دیہاتی مجھ سے ملنے آگئے۔ ان میں ایک عورت اور تین مرد تھے۔ میں نے فوراً انہیں اپنے کمرے میں بلالیا۔

ان میں سے ایک دبلے پتلے دراز قامت شخص کا نام مشتاق معلوم ہوا۔ مشتاق کی عمر پچاس کے اریب قریب رہی ہوگی۔ وہ عورت مشتاق کی بیوی خالدہ تھی۔ خالدہ عام سی صورت شکل کی مالک ایک پینتالیس سالہ عورت تھی۔ باقی دو افراد سراج اور صدیق، مشتاق کے دائیں بائیں والے پڑوسی تھے۔ وہ چاروں خاصے پریشان نظر آتے تھے۔ میں نے انہیں ایک چوبی بینچ پر بٹھایا پھر ان کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں بھئی! آپ لوگوں کا کیا مسئلہ ہے۔ میرے پاس کیا لینے آئے ہو؟''

''تھانے دار صاحب......!'' مشتاق گلوگیر آواز میں بولا۔ ''تھانے کوئی شوق سے نہیں آتا۔ ہم لوگ بہت مشکل میں ہیں۔''

''میں نے بھی تو وہی پوچھا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کون سی پریشانی آپ لوگوں کو یہاں کھینچ لائی ہے؟''

بھاری بھرکم جثے کے مالک سراج نے مجھے بتایا۔

''تھانے دار جی! مشتاق کی بیٹی لاپتا ہوگئی ہے......''

''یہ کب کی بات ہے......؟'' میں سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔

''صحیح وقت کا تو پتا نہیں جناب۔'' مشتاق نے دکھ بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''صبح تو وہ گھر میں موجود تھی۔ بس دوپہر کے بعد کہیں نظر نہیں آرہی۔''

''لڑکی دوپہر سے غائب ہے اور تم رپورٹ درج کرانے اب میرے پاس آئے ہو......!'' میں نے گھور کر مشتاق کی طرف دیکھا۔ ''شام ہوچکی ہے۔ چند منٹ کے بعد اندھیرا پھیل جائے گا۔''

''وہ جی بات دراصل یہ ہے کہ......'' مشتاق کی بیوی بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''دوپہر سے اب تک ہم پینو کو گاؤں کے اندر ہی تلاش کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ ہم نے ہر گھر میں جھانک لیا اور پنڈ کے ہر بندے سے پوچھ لیا لیکن کہیں سے بھی پینو کے بارے میں کچھ پتا نہیں چل سکا۔ اس کے بعد ہی ہم مدد لینے آپ کے پاس آئے ہیں۔ پتا نہیں، میری جوان جہان بیٹی کہاں گم ہوگئی ہے......!''

بات کے اختتام پر وہ آنسو بہانے لگی۔ میں نے مشتاق کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''غالباً تمہاری بیٹی کا نام پروین ہے جو بگڑ کر ''پینو'' بن گیا ہے؟''

''جی تھانے دار صاحب......!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

خالدہ نے چند لمحے پہلے اپنی بیٹی کے لیے ''جوان جہان'' کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ اسی تناظر میں، میں نے مشتاق سے پوچھا۔ ''پینو کی عمر کیا ہے؟''

''اٹھارہ سال!'' اس نے جواب دیا۔

''کیا پینو اس سے پہلے بھی کبھی گھر سے غائب ہوئی ہے؟''

''نہیں سرکار...... ایسا پہلی بار ہوا ہے۔''

''گھر میں تمہارے اور خالدہ کے علاوہ اور کتنے افراد رہتے ہیں؟'' میں نے استفسار کیا۔

''کوئی نہیں مائی باپ۔'' وہ نحیف سی آواز میں بولا۔ ''پینو ہماری اکلوتی بیٹی ہے۔ بس ہم تین ہی بندے اس گھر میں رہتے ہیں اور...... پینو کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔ میری بیٹی بڑی اللہ والی تھی۔''

''تم لوگوں کو کب معلوم ہوا کہ پینو گھر میں موجود نہیں ہے؟''

''دوپہر کے وقت جی۔'' مشتاق کے بجائے خالدہ نے جواب دیا۔ ''میں پینو کو گھر میں چھوڑ کر رشیدہ کے ساتھ شاہ جی کے آستانے کی طرف چلی گئی تھی۔ جب میں آستانے سے لوٹی تو پینو گھر میں کہیں دکھائی نہیں دی۔ میں نے مشتاقے (مشتاق) سے پوچھا تو اسے بھی پینو کا کچھ پتا نہیں تھا۔ بس جی...... پھر ہم نے پینو کو اِدھر اُدھر ڈھونڈنا شروع کردیا۔''

''مشتاق! تم کیا کام کرتے ہو؟'' میں نے گمشدہ پینو کے باپ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ ''جب خالدہ شاہ جی کے آستانے پر گئی تھی، اس وقت تم کہاں تھے؟''

''میں اپنی دکان میں کام کررہا تھا اور یہ دکان میرے گھر کے سامنے والے حصے میں ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''میں سائیکلوں کی مرمت کا کام کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ میں نے دکان میں ٹائر، ٹیوب اور دیگر سامان بھی رکھا ہوا ہے۔ جس کی جو ضرورت ہوتی ہے، میں مناسب قیمت پر فروخت کردیتا ہوں۔ سمجھ لیں کہ چمن آباد کے لوگوں کو شہر کا پھیرا نہیں لگانا پڑتا، میں ان کی ضرورت کی چیز، شہر والے ریٹ پر ہی دے دیتا ہوں اور......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''میں نے اپنی دکان میں نصف درجن چھوٹی بڑی سائیکلیں بھی رکھی ہوئی ہیں جو میں فی گھنٹا کے حساب سے کرائے پر بھی دیتا ہوں۔''

''مشتاق!'' میں نے توجہ سے اس کی بات سننے کے بعد کہا۔ ''تم نے اپنی دکان کی تفصیل تو بتادی۔ ذرا یہ اندازہ لگانے کی کوشش بھی تو کرو کہ تمہاری بیٹی کہاں جاسکتی ہے؟''

موضع چمن آباد میرے تھانے سے لگ بھگ ایک میل کی دوری پر جنوب میں، جی ٹی وی روڈ پر ہی واقع تھا۔ جی ٹی (جنرل ٹرنک) روڈ کی دونوں جانب کارخانے اور فیکٹریاں تھیں اور ان فیکٹریوں کے عقب میں کہیں کہیں رہائشی آبادیاں موجود تھیں جبکہ زیادہ تر زمین زرعی کھیتوں پر مشتمل تھی۔ چمن آباد نامی اس گاؤں کے فرنٹ پر تین ٹیکسٹائل ملز تھیں جن کے دائیں بائیں خالی پلاٹس تھے۔ ایک لحاظ سے آپ انہیں کھیت بھی کہہ سکتے ہیں۔

مشتاق نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''تھانے دار صاحب! اگر مجھے یہ اندازہ ہوتا کہ پینو کہاں گئی ہوگی تو پھر میں فریاد لے کر آپ کے پاس کیوں آتا۔ بس جی...... پینو بہت پہنچی ہوئی تھی۔ اسے سب پتا تھا......!''

پینو کے حوالے سے مشتاق نے پہلے بھی کچھ اسی قسم کی بات کی تھی کہ ''میری بیٹی بڑی اللہ والی تھی۔'' اور اب وہ گمشدہ پینو کو بہت گیانی ظاہر کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''مشتاق! تمہارے آخری جملے کا کیا مطلب ہے؟

پینو کو "سب" کیا پتا تھا؟"

"مشتاقے کا دماغ خراب ہوگیا جی......" خالدہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "یہ پینو سے اندھی محبت کرتا ہے۔ اس کے لاڈ پیار نے پینو کو بڑا ضدی اور من موجی بنا دیا ہے۔ میری تو وہ ایک نہیں سنتی۔ ذرا سا کچھ کہہ دوں تو فوراً باپ کو شکایت لگاتی ہے اور مشتاقا بھی اسے سمجھانے کے بجائے الٹا مجھ ہی کو ڈانٹتا ہے۔"

"خالدہ! تم چند منٹ بالکل خاموش بیٹھو۔" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "میں پہلے مشتاق سے بات کرلوں، پھر تمہاری باری بھی آئے گی۔"

"کریں جی آپ مشتاقے سے بات۔" وہ خفگی آمیز لہجے میں بولی۔ "یہ تو ایسے ظاہر کر رہا ہے جیسے پینو کے گم ہونے کا صرف اسی کو دکھ ہے۔ میں تو جیسے اس کی سوتیلی ماں ہوں......"

مجھے اندازہ ہوگیا کہ اگر خالدہ وہاں موجود رہی تو مجھے ڈھنگ سے بات نہیں کرنے دے گی۔ اتنی دیر میں، میں نے یہ بھی محسوس کرلیا تھا کہ صدیق اور سراج پڑوسی ہونے کے ناتے محض اخلاقی فرض نبھاتے ہوئے ان میاں بیوی کے ساتھ آگئے تھے۔ میں نے ان تینوں مرد وزن کو مخاطب کرتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"خالدہ، صدیق اور سراج...... تم باہر جا کر برآمدے میں بیٹھو۔ جس کی ضرورت ہوگی، میں اسے اندر بلالوں گا۔"

صدیق اور سراج کوئی تاثر دیے بغیر اور خالدہ بُرا سا منہ بناتے ہوئے میرے کمرے سے باہر چلی گئی تو میں مشتاق کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے مستفسر ہوا۔

"ہاں بھئی مشتاق! اب بتاؤ، تم پینو کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے؟"

"تھانے دار صاحب! مجھے پینو کے گم ہونے کا بڑا صدمہ ہے۔ میں اپنے دکھ کو الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "پچھلی رات کو پینو نے جو بات کی، اس وقت میں نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا تھا لیکن اب یہ ثابت ہوگیا کہ وہ جانتی تھی کہ آج وہ اس گھر میں موجود نہیں ہوگی......"

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "پینو نے پچھلی رات تم سے ایسی کون سی بات کی تھی؟"

"ہم دونوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور یہ ہمارا روز کا معمول تھا۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "خالدہ جلدی سو جاتی تھی اور ہم باپ بیٹی بیٹھے اِدھر اُدھر کی بات چیت میں لگے رہتے تھے۔ گزشتہ رات بھی ہم دونوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ پینو یکدم اداس ہوگئی۔

"کیا ہوا میری دھی رانی؟" میں نے فکرمندی سے پوچھا۔

وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

"کچھ نہیں ابا......!"

"کچھ تو ہے بیٹا جی......" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تشویش بھرے انداز میں سوال کیا۔ "تم یکدم بجھ سی کیوں گئی ہو۔ کوئی پریشانی ہے تو مجھے بتاؤ......!"

"کوئی پریشانی نہیں ابا!" وہ مرجھائی ہوئی آواز میں بولی۔

"کیا ماں نے تمہیں ڈانٹا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں ابا......!"

"پھر...... پھر تم یکایک صدیوں کی بیمار کیوں نظر آنے لگی ہو۔" میں نے تشویش آمیز دلار سے جاننا چاہا۔ "ایسا محسوس ہو رہا ہے، کسی نے تمہارے وجود میں سے روح کھینچ لی ہو...... کیوں میری لاڈو......؟"

"ابا......!" وہ حسرت بھری نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولی۔ "آج کی رات ہم دونوں ایک ساتھ بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں۔ کل رات ہم میں سے کوئی ایک اس گھر میں موجود نہیں ہوگا......" مشتاق نے لمحاتی توقف کر کے گھائل نظر سے مجھے دیکھا پھر نمناک لہجے میں بولا۔

"تھانے دار صاحب! پینو بہت پہنچی ہوئی تھی۔ اسے کل رات ہی یہ معلوم ہوگیا تھا کہ آج وہ گھر میں نہیں ہوگی۔ میری مت ماری گئی تھی کہ اس وقت میں پینو کی بات میں چھپے رمز کو سمجھ نہیں سکا تھا۔ میں بھی کتنا بے وقوف ہوں......"

بات کے اختتام پر وہ دونوں ہاتھوں سے دھیرے دھیرے اپنا ماتھا پیٹنے لگا اور میں اس کی سادگی نما حماقت پر، تصور میں اپنا سر پیٹ کر رہ گیا۔ وہ پینو کی جس بات کو اس کی کوئی کرامت اور سچی پیش گوئی سمجھ رہا تھا وہ میری نگاہ میں پینو کے فرار کا ایک اشارہ تھا۔ اگر میں غلطی پر نہیں تھا تو پینو کسی کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی تھی۔

میں نے ایک دکھی باپ کے جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے معتدل انداز میں پوچھا۔ "مشتاق! تم نے چمن آباد میں اچھی طرح پینو کو تلاش کرلیا ہے نا؟"

موضع چمن آباد تین سو گھروں پر مشتمل ایک گنجان آباد گاؤں تھا۔ اس کی آبادی کم و بیش تیرہ سو افراد تھی۔ ایسے بستے بستے گاؤں میں کسی ایک فرد کو تلاش کرنا اگر مشکل نہیں تو یہ کام آسان بھی نہیں تھا۔

"جی تھانے دار صاحب!" مشتاق نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "سب سے پوچھ کر دیکھ لیا

جناب۔ کوئی بھی پینو کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ پتا نہیں، میری بیٹی کو زمین نے نگل لیا یا آسمان کھا گیا۔ اب آپ ہی ہمارا آخری سہارا ہیں......" بات پوری کرتے ہی اس نے میرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے اور امداد طلب انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

"مشتاق! کیا تم نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ پینو کے علاوہ بھی کوئی شخص چمن آباد سے غائب ہے؟" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کیا مطلب جی......؟" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ "میں نے جو پوچھا ہے، اس کا جواب دو مشتاق؟"

"نہیں جی...... مجھے کسی اور بندے کے غائب ہونے کا علم نہیں ہے۔" وہ بہ دستور الجھے ہوئے انداز میں بولا۔ "آپ کے سوال سے تو یہی محسوس ہو رہا ہے کہ آپ پینو کے گھر سے بھاگ جانے کے بارے میں سوچ رہے ہیں......!"

"مشتاق! میں ایک پولیس آفیسر ہوں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اور ہماری تفتیش کی گاڑی ہمیشہ شک کے پیٹرول سے چلتی ہے۔ بعض اوقات ہمیں خود پر بھی شک کرنا پڑتا ہے۔ تم چاہے اپنی بیٹی کو بہت پہنچی ہوئی اور اللہ والی سمجھتے رہو۔ عین ممکن ہے کہ تمہارا یہ سمجھنا صد فیصد درست ہو لیکن میں ایک پولیس والا ہوں اور میرے سامنے ایک جوان جہان لڑکی کی پراسرار گمشدگی کا معاملہ رکھا ہوا ہے لہٰذا دیگر امکانات گمشدگی کے علاوہ میں یہ سوچنے پر بھی مجبور ہوں کہ ہوسکتا ہے، پینو اپنی مرضی سے خود ہی اکیلی یا کسی کے ساتھ کہیں چلی گئی ہو اور......" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر ان الفاظ میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"اور باقی باتیں خالدہ کے سامنے ہوں گی۔ تم اپنی بیوی کو اندر بلا لو۔"

وہ بینچ سے اٹھا اور بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے میرے کمرے کے دروازے پر پہنچا پھر ہاتھ کے اشارے سے اس نے خالدہ کو اندر بلا لیا۔ جب وہ میاں بیوی میرے سامنے بیٹھ چکے تو میں نے باری باری دونوں کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لینے کے بعد تسلی بھرے انداز میں کہا۔

"اس بات کا اطمینان رکھو کہ میں جلد یا بدیر تمہاری بیٹی کو ڈھونڈ نکالوں گا لیکن اس کے لیے میری ایک شرط ہے......!"

انہوں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر خالدہ مجھ سے مستفسر ہوئی۔ "کیسی شرط تھانے دار صاحب؟"

"سچ بولنے کی شرط!" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "میں جو پوچھوں اس کا سولہ آنے درست جواب دینا ہوگا ورنہ مجھ سے کسی مدد کی امید نہ رکھیں۔ آپ لوگوں کے تعاون کے بغیر میں کچھ بھی نہیں کرسکوں گا۔"

"تھانے دار صاحب! ہم آپ سے کسی قسم کی غلط بیانی کیوں کریں گے۔ آپ ہم سے پوچھیں جو بھی پوچھنا چاہتے ہیں......"

میں نے پوچھا۔ "اب تک پینو کی شادی کیوں نہیں ہوئی۔ ماشاء اللہ! وہ اٹھارہ سال کی تھی۔ خوب صورت اور جوان جہان تھی۔ لڑکیوں کے تو چودہ پندرہ سال کی عمر ہی میں رشتے آنا شروع ہوجاتے ہیں۔ اب تک پینو کے کتنے رشتے آئے تھے؟"

"یہی تو سب سے بڑی مشکل ہے تھانے دار صاحب!" مشتاق نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ "آج تک پینو کا کوئی بھی ڈھنگ کا رشتہ نہیں آیا۔ بس، ایک ہی لڑکا اس سے شادی کا خواہش مند ہے اور میں اس کے ساتھ اپنی بیٹی کا نکاح نہیں کرسکتا......"

"کون ہے وہ لڑکا؟" میں نے کریدنے والے انداز میں سوال کیا۔

"پتا نہیں، آپ ہوائی چیزوں پر یقین رکھتے ہیں یا نہیں......!" خالدہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

قبل اس کے کہ میں خالدہ کے اظہارِ خیال پر کوئی سوال داغتا، مشتاق نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔ "اس لڑکے کا نام اعجاز ہے لیکن گاؤں میں سب اسے "جاجو" کہتے ہیں۔ وہ پکوڑے اور سموسے وغیرہ کا ٹھیلا لگاتا ہے اور اکثر اپنے ٹھیلے کے پہیوں میں ہوا بھروانے وہ میری دکان پر آجاتا ہے اور باتوں کے بہانے وہ کافی دیر میرے پاس بیٹھا رہتا ہے۔ اس نے بعض اوقات ڈھکے چھپے الفاظ میں اور ایک آدھ بار واضح انداز میں مجھے باور کرایا ہے کہ وہ پینو کو پسند کرتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن میں نے اسے صاف انکار کردیا مگر وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہا۔ اپنے ٹھیلے کے ٹائروں میں ہوا بھروانے کے بہانے وہ روزانہ میری دکان پر آتا ہے اور پھر کافی دیر ادھر ہی رکا رہتا ہے۔ اس نے آج تک مجھ سے کوئی غلط بات نہیں کی۔ وہ مجھ سے بڑے ادب واحترام سے ملتا ہے۔ اس کے شریفانہ رویے کو دیکھ کر میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا

کہ...... جاؤ یہاں سے اور کبھی میری دکان کا رخ نہیں کرنا۔ آپ سیانے بیانے ہیں تھانے دار صاحب......'' وہ چند سیکنڈ کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''آپ تو جانتے ہیں، جس گھر کے آنگن میں بیری کا درخت ہوتا ہے وہاں پتھر تو آیا ہی کرتے ہیں۔ بیٹیوں کے والدین کو ایسے حالات سے گزرنا ہی پڑتا ہے......!''

''ہاں...... میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں مشتاق!'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ تم جاجو کو پینو کے قابل کیوں نہیں سمجھتے تھے۔ اس میں ایسا کون سا عیب ہے؟''

''کوئی ایک عیب ہو تو بتائیں نا جی۔'' مشتاق کے بجائے خالدہ بول اٹھی۔ ''ہماری پینو پانچ جماعتیں پاس ہے، حسین و جمیل ہے، جوان ہے اور ماشاءاللہ! صحت مند اور اونچی لمبی ہے۔ وہ اٹھارہ سال کی ہے مگر دیکھنے والے اس کی صحت اور تندرستی کی وجہ سے اسے تیئس چوبیس کی سمجھتے ہیں اور یہ جاجو......'' اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''پینو کے مقابلے میں آدھے قد کاٹھ کا ہے۔ اسے پینو کے برابر کھڑا کریں تو وہ پینو کی بغل میں آئے گا۔ اس پر ''نہ منہ، نہ متھا تے جن پہاڑوں لتھا'' والا معاملہ ہے جی۔ اوپر سے جاجو چٹا ان پڑھ بھی ہے اور رنگت ایسی توے کے مانند کہ اگر اچانک سامنے آجائے تو بچے کیا، بڑے بھی ڈر جائیں۔ میں اپنی مصری کی ڈلی، نازوں سے پلی پینو کو اس لنگور کے ساتھ بیاہنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی......''

اس بات کا مجھے بخوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ خالدہ زبان کی خاصی تیز اور مزاج کی طرار تھی۔ اس کے مقابلے میں مشتاق کے انداز میں ایک دھیما پن اور ٹھہراؤ پایا جاتا تھا۔ دونوں نے ایک ہی کردار یعنی اعجاز عرف جاجو کا ذکر کیا تھا مگر ان کے بیان کا زاویہ اور درجۂ حرارت ایک دوسرے سے خاصا مختلف تھا۔ میں نے خالدہ کی آتشیں اور ہتک آمیز بات تحمل سے سنی اور اس کے خاموش ہونے پر گہری سنجیدگی سے کہا۔

''خالدہ بی بی! ساری شکلیں اللہ کی بنائی ہوئی ہیں اور اس قادر مطلق کی کسی تخلیق کو مذاق اور تحقیر کا نشانہ بنانا انتہائی غیر اخلاقی بلکہ غیر انسانی فعل ہے۔ بے شک! ہر والدین کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی اولاد کا رشتہ جہاں چاہیں کریں اور جہاں نہ چاہیں، نہ کریں مگر تم نے جس طرح جاجو کا تعارف کرایا ہے وہ کسی بھی طور مناسب نہیں۔ انسانوں کو شکل و صورت عطا کرنے والے پروردگار سے ہر لحہ ڈرتے رہنا چاہیے۔ پتا نہیں، اس مالک و مختار کو ہمارا کون سا عمل کس وقت ناگوار گزر جائے اور وہ اس کے بدلے ہمیں کس مشکل میں ڈال دے......!''

اپنے کہے پر شرمندہ ہونے کے بجائے خالدہ نے مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے انکشاف انگیز انداز میں کہا۔ ''اس کے علاوہ ایک اور خاص بات بھی ہے تھانے دار صاحب......!''

تو ثابت یہ ہوا کہ خالدہ زبان دراز ہونے کے ساتھ ساتھ نامعقول بھی تھی۔ اس وقت وہ ایک دکھی ماں کی حیثیت سے اپنی گمشدہ بیٹی کی رپورٹ درج کرانے میرے پاس آئی تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں اس کے کانوں کے کیڑے جھاڑ کر اس کی طبیعت صاف کردیتا مگر صورتِ حال کے پیش نظر میں نے ہاتھ ہولا رکھتے ہوئے کہا۔

''خالدہ بی بی! اب جلدی سے وہ خاص بات بھی بتادو؟''

''تھوڑی دیر پہلے میں نے ہوائی چیزوں کا ذکر کیا تھا......'' وہ ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے بولی۔ ''کیا آپ ایسی چیزوں کو مانتے ہیں؟''

میں نے بس ایسے ہی کہہ دیا۔ ''ہوائی چیزوں سے تمہاری مراد جہاز، مکھی، مچھر، غبارے، پتنگ، پرندے وغیرہ ہی ہے نا......؟''

''نہیں جی...... آپ میری بات نہیں سمجھے!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بڑی شدت سے بولی۔ ''میرے کہنے کا مطلب تھا...... جن، پری اور دوسری ہوائی مخلوقات جو عام انسانوں کو نظر نہیں آتیں......''

''میں ایسی ہوائی مخلوقات پر یقین رکھتا ہوں یا نہیں اور یا پھر کس حد تک یقین رکھتا ہوں، یہ جاننا تمہارے لیے ضروری نہیں ہے۔'' میں نے خالدہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''تم جو کہنا چاہتی ہو، وہ بیان کرو۔''

''پھر تو آپ سے بات کرنا ہی فضول ہے۔'' وہ مایوسی بھرے لہجے میں بولی۔ ''میں سمجھ گئی ہوں، آپ ہوائی چیزوں کو نہیں مانتے......''

خالدہ کی اس ''سمجھ'' کے جواب میں، میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے ہی مشتاق بول اٹھا۔

''تھانے دار صاحب! شاہ جی نے خالدہ کو بتایا ہے کہ پینو پر ایک جن عاشق ہوگیا ہے۔ وہ جن مسلمان ہے اور اس کا نام گلزار ہے۔ یہ گلزار ہی پینو کا کوئی رشتہ نہیں آنے دیتا۔ شاہ جی کا کہنا ہے کہ اگر ہم نے زبردستی پینو کی کہیں شادی کرنے کی غلطی کی تو گلزار، پینو کے شوہر کی گردن توڑ

ڈالے گا۔ پینو کی شادی اسی وقت ہو سکتی ہے۔ جب گلزار اس کی جان چھوڑ دے ورنہ اسے ساری زندگی گلزار کی خاطر کنواری ہی رہنا ہوگا......"

"بہت خوب......!" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "یہ مسلم جن مسٹر گلزار تو بڑا دلچسپ عاشق ہے۔ پینو کے لیے کوئی ڈھنگ کا رشتہ نہیں آنے دیتا اور اگر اس کی منظوری کے بغیر آپ لوگوں نے پینو کی کسی شخص سے شادی کر دی تو وہ اس بندے کی گردن توڑ دے گا لیکن اس گلزار کا جاجو جیسے ٹھنگنے کالے بھجنگ انسان پر کوئی بس نہیں چلتا۔ جاجو، پینو سے شادی کی خواہش کو اپنے دل میں بسائے اور ہونٹوں پر سجائے روزانہ پینو کے باپ کے پاس آتا ہے مگر اس کی گردن ابھی تک صحیح وسلامت ہے...... ہیں نا؟"

"آپ گلزار کا مذاق نہ اڑائیں جی......" خالدہ نے ہمدردی بھرے لہجے میں مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ "ہوائی مخلوق کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ انہیں انسانوں کی اگر کوئی بات بری لگ جائے تو یہ کچھ بھی کر سکتے ہیں...... کچھ بھی!"

آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے خالدہ کی آواز سے خوف جھلکنے لگا تھا۔ مشتاق بھی مجھے سراسیمگی کی کیفیت میں دکھائی دیا۔ میں نے واشگاف الفاظ میں کہا۔

"میں اس نام نہاد گلزار بلکہ نامراد گلزار کا مذاق نہیں اڑا رہا بلکہ تم دونوں کی عقل کا ماتم کر رہا ہوں جو تم کسی شاہ جی کی فضول باتوں کو سچ سمجھے بیٹھے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ......" میں نے براہِ راست خالدہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ "شاہ جی نے تمہیں اس گلزار نامی جن کو اتارنے کا کوئی طریقہ بھی بتایا ہوگا...... ہیں نا؟"

"نن...... نہیں جی۔" مشتاق نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔"

"میں نے تم سے پوچھا ہے کیا جو تم اپنی لاعلمی کا اظہار کر رہے ہو؟" میں نے ڈانٹ آمیز نظر سے اسے گھورا۔ "تم تھوڑی دیر چپ بیٹھو۔ مجھے شاہ جی کی مریدنی سے بات کرنے دو۔ یہ آج بھی شاہ جی کے آستانے پر حاضری دے کر آئی ہے......!"

میرے سرزنش بھرے معنی خیز الفاظ کی چبھن نے مشتاق کی زبان کو حلق کے نیچے اتار دیا۔ وہ ہونٹ بھینچ کر خاموش ہو بیٹھا۔ میں نے سوالیہ نظر سے خالدہ کی طرف دیکھا اور کہا۔

"تم آج رشیدہ کے ساتھ شاہ جی کے آستانے پر کیا کرنے گئی تھیں؟"

"میں پینو کے سلسلے ہی میں شاہ جی سے بات کرنے گئی تھی۔" وہ جزبز ہوتے ہوئے بولی۔

"کس قسم کی بات؟" میں نے پوچھا۔

"پینو پر عاشق جن کو بھگانے کی بات......" اس نے بتایا۔ "شاہ جی نے کہا ہے کہ اگر ان کی بات پر عمل کیا گیا تو وہ تین راتوں میں گلزار کو جلا کر راکھ کر دیں گے۔ پھر پینو کا معاملہ ایک دم صاف ہو جائے گا۔"

پینو کے بارے میں ابھی تک مجھے جو کچھ معلوم تھا اس کے مطابق مشتاق آج اپنی دکان میں حسب معمول کام کر رہا تھا اور خالدہ اور پینو گھر کے اندرونی حصے میں موجود تھیں۔ پھر خالدہ، کسی رشیدہ نامی عورت کے ساتھ شاہ جی کے آستانے کی طرف چلی گئی تھی اور جب وہ واپس لوٹی تو پینو گھر سے غائب تھی۔ اس تناظر میں، میں نے ایک اہم سوال کیا۔

"کیا یہ تین راتوں والے عمل کی بات شاہ جی نے آج تم سے کی تھی؟"

"نہیں جی۔ یہ بات تو انہوں نے ایک ماہ پہلے ہی مجھے بتا دی تھی۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "لیکن میں نے مشتاق سے آدھی بات کی تھی یعنی پینو پر عاشق جن گلزار کے بارے میں تو بتا دیا تھا لیکن اس جن کو اتارنے والے عمل کا ذکر نہیں کیا تھا کیونکہ مشتاق کبھی بھی اس عمل کے لیے راضی نہ ہوتا......"

"کیوں...... اس عمل میں ایسی کون سی بات تھی جو مشتاق کے لیے ناقابلِ قبول تھی؟" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

"مشتاق، پینو سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے۔" خالدہ نے بتایا۔ "یہ ایک لمحے کے لیے بھی پینو کو اِدھر اُدھر نہیں ہونے دیتا اور شاہ جی نے کہا تھا کہ پینو کو تین راتیں ان کے آستانے پر گزارنا ہوں گی۔ وہ پینو پر کوئی مخصوص عمل کریں گے جس کے نتیجے میں وہ خبیث جن گلزار ہمیشہ کے لیے پینو کی جان چھوڑ دے گا......"

مشتاق غصے سے لال پیلا ہوتے ہوئے بولا۔ "کم بخت......" اس نے خالدہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ بات تم نے ایک ماہ تک مجھ سے کیوں چھپائے رکھی؟ اگر تم نے مجھے پہلے بتایا ہوتا تو میں آستانے پر جا کر شاہ جی کی ساری بزرگی ناک کے راستے نکال دیتا۔ اس کی یہ مجال کہ میری پینو کے بارے میں ایسی بات کرے......!"

"دیکھ لیا تھانے دار صاحب آپ نے مشتاق کا

غصہ......!'' وہ اپنے شوہر کی جانب اشارہ کرکے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''میں اسی لیے اب تک چپ سادھے بیٹھی تھی۔ مشتاقا، پینو کے حوالے سے ذرا سی بات سن کر بھڑک اٹھتا ہے......''

''تو میں اس میں غلط کیا کرتا ہوں......؟'' وہ بیوی کو آنکھیں دکھاتے ہوئے غرایا۔ ''اگر مجھے اس بات کا پتا ہوتا تو میں شاہ جی کا دماغ درست کردیتا۔''

''میں بات کررہا ہوں نا......؟'' میں نے ان دونوں میاں بیوی کو جھڑکا۔ ''اگر تمہیں اسی طرح چونچیں لڑانا تھیں تو میرے پاس کیا لینے آئے ہو......'' پھر میں نے مشتاق کو مخاطب کرتے ہوئے وارننگ دینے والے انداز میں کہا۔ ''میں نے تمہیں چپ بیٹھنے کو کہا ہے نا۔ اگر اب تم بیچ میں بولے تو میں تمہیں کمرے سے نکال دوں گا اور پھر تمہاری کوئی بھی بات نہیں سنوں گا...... سمجھ گئے یا کوئی اور طریقہ اختیار کروں؟''

''جی......'' وہ رونی صورت بنا کر بولا۔ ''سمجھ گیا جناب۔''

میں نے خالدہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے سوال کیا۔ ''ایک ماہ پہلے جب شاہ جی نے تمہیں، پینو کا جن اتارنے والے تین راتوں کے عمل کے بارے میں بتایا تھا تو اس کے جواب میں تم نے کیا کہا تھا؟''

''میں نے شاہ جی کو صاف منع کردیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ پینو کا باپ اس کام کے لیے راضی نہیں ہوگا۔''

''پھر شاہ جی نے کیا کہا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بولے، آپ لوگوں کی مرضی ہے۔ میں زبردستی تو نہیں کرسکتا۔'' وہ بتانے لگی۔ ''آپ لوگ لڑکی کے ماں باپ ہو۔ جب آپ کو اس کی فکر نہیں تو مجھے کیا پڑی ہے پریشان ہونے کی مگر میری ایک بات نوٹ کرلو خالدہ بی بی......'' انہوں نے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔ ''یہ جن بڑا ڈھیٹ ہے، خود بخود کبھی بھی نہیں جائے گا۔ اس کا اتارا کرنا ہی پڑے گا ورنہ ایک دن یہ خبیث پینو کی جان بھی لے سکتا ہے۔''

''پھر تم نے کیا کیا خالدہ بی بی؟'' میں نے کرید کا عمل جاری رکھا۔

''کچھ نہیں جی۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''بس، میں نے صبر کرلیا اور چپ ہو کر بیٹھ گئی۔''

میرا ذہن پینو کی گمشدگی والے معاملے کی کڑیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر ایک زنجیر کی شکل دینے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اسی ذیل میں خالدہ سے میں نے پوچھ لیا۔

''اس ایک ماہ کے دوران تم شاہ صاحب سے ملنے کتنی مرتبہ گئی ہو؟''

''ایک بار بھی نہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ معتدل انداز میں بولی۔ ''آج بھی رشیدہ اپنے کسی کام سے شاہ جی کے آستانے پر گئی تھی کہ ضد کرکے مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئی۔ یہی سوچا تھا کہ میں شاہ جی سے پینو کے لیے دعا ہی کروا لوں گی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ جب میں واپس آؤں گی تو پینو گھر سے غائب ہوچکی ہوگی......'' بات کے اختتام پر وہ روہانسی ہوگئی۔

''کہیں شاہ جی کی دعا الٹی تو نہیں پڑ گئی......!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''انہوں نے کوئی دافع جن دعا کی اور گلزار نامی وہ جن شاہ جی کا بھی استاد نکلا۔ وہ پینو کو اپنے ساتھ لے کر کہیں دفع ہوگیا۔''

میں نے یہ بات برسبیل مذاق کی تھی۔ پتا نہیں، میری بات ان میاں بیوی کی سمجھ میں آئی یا ان کی کھوپڑیوں کے اوپر سے گزر گئی۔ بہرحال ان لمحات میں وہ دونوں مجھے بڑی مشکل میں نظر آئے۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ میرے مخاطب دونوں ہی تھے۔

''جب آپ دونوں پینو کو تلاش کررہے تھے تو اس وقت جاجو کہاں تھا؟''

میرے اس اچانک سوال پر انہوں نے چونک کر الجھن زدہ نظروں سے میری طرف دیکھا پھر مشتاق نے جواب دیا۔

''پتا نہیں تھانے دار صاحب! وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا یا ہوسکتا ہے، وہ مجھے نظر تو آیا ہو لیکن پریشانی کے باعث وہ میرے ذہن سے نکل گیا۔''

''میں نے تو آج اس منحوس کی شکل تک نہیں دیکھی۔'' خالدہ نے کڑوے لہجے میں بتایا۔ ''نہ تو مشتاقے کی دکان پر اور نہ ہی گاؤں میں اور کہیں......''

''اب میں تم لوگوں سے جو پوچھنے جارہا ہوں اس کا بہت سوچ سمجھ کر جواب دینا ہے۔'' میں نے باری باری ان کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم نے غلط جواب دیا یا مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کی تو پھر میں آپ کی بیٹی کو ڈھونڈ نہیں پاؤں گا۔ تم لوگ پینو کو ہمیشہ کے لیے کھو دوگے......!''

''ایسی باتیں نہ کریں تھانے دار صاحب!'' مشتاق نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''میں پینو کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔''

خالدہ روہانسی ہوگئی۔ ''تھانے دار جی......!'' اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر منت ریز لہجے میں کہا۔ ''ہم نے اب تک آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ اب بھی آپ جو پوچھو گے، ہم بالکل سچ بتائیں گے۔ آپ کسی بھی طرح ہماری پینو کو ڈھونڈ نکالیں۔ ہماری زندگی میں صرف ایک پینو ہی تو ہے......''

''مجھے یہ بتاؤ......'' میں نے ان کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔ ''پینو کا کسی سے کوئی چکر وغیرہ تو نہیں تھا؟''

''ہرگز نہیں!'' وہ یک زبان ہو کر حتمی انداز میں بولے۔

''ٹھیک ہو گیا......'' میں نے ایک طویل اور آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''اب آپ لوگ گھر جا کر آرام کرو۔ میں نے پینو کے بارے میں تمام ضروری باتیں نوٹ کر لی ہیں۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں جلد از جلد پینو کو ڈھونڈ نکالوں گا۔ میں کل صبح چمن آباد کا چکر بھی لگاؤں گا۔ باقی باتیں وہیں پر ہوں گی۔''

وہ میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گئے۔

ان کے جانے کے بعد میں نے کانسٹیبل حیدر علی کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ حیدر علی کا تعلق موضع چمن آباد ہی سے تھا اور وہ روزانہ رات کو اپنے گھر چلا جاتا تھا۔ اگلی صبح وہ دوبارہ تھانے آ کر اپنی ڈیوٹی شروع کر دیتا تھا۔ وہ اس وقت چھٹی کے لیے پر تول ہی رہا تھا۔ میں نے ضروری ہدایات کے بعد حیدر علی کو گھر جانے کی اجازت دے دی۔

☆☆☆

اگلی صبح خاصی خنک اور دھند دار تھی۔ صبح دس بجے تک بھی سورج کا کہیں نام و نشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کانسٹیبل حیدر علی اپنی ڈیوٹی پر آیا تو میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ گزشتہ رات میں نے خصوصی ہدایات کے ساتھ حیدر علی کو تھانے سے رخصت کیا تھا۔

''ہاں بھئی! کیا رپورٹ ہے؟'' میں نے حیدر علی کی آمد پر پوچھا۔

''جاجو کل دن بھر گاؤں میں موجود نہیں تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''مجھے پتا چلا ہے، وہ صبح کا گیا شام کو واپس لوٹا تھا۔''

''اور شاہ جی کا کیا حال احوال ہے؟''

''وہ اپنے آستانے پر حسب معمول موجود ہے۔'' حیدر علی نے جواب دیا۔ ''کل وہ چمن آباد کے باہر کہیں آیا گیا نہیں۔ میری معلومات کے مطابق خالدہ اور رشیدہ لگ بھگ ایک گھنٹا آستانے پر گزار کر آئی تھیں۔ مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ پینو کو آستانے کے آس پاس یا آستانے کے اندر کہیں نہیں دیکھا گیا۔''

''پینو لاپتا ہے، اس امر میں کسی شک و شبہے کی گنجائش تلاش نہیں کی جا سکتی حیدر علی!'' میں نے کانسٹیبل کے چہرے پر نگاہ جما کر گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ورنہ مشتاق اور اس کی گھر والی یوں روتے کرلاتے میرے پاس نہ آتے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پینو گاؤں میں موجود نہیں ہے۔ تم نے پینو کے غیاب کے بارے میں کیا معلوم کیا ہے؟''

''ملک صاحب! یہ بات پورے چمن آباد کے علم میں آ چکی ہے کہ پینو کہیں چلی گئی ہے لیکن کوئی بھی یہ نہیں جانتا کہ وہ کہاں گئی ہے۔'' کانسٹیبل نے بڑی رسان سے جواب دیا۔ ''بہرحال، اس سلسلے میں مجھے ایک اشارہ ملا ہے۔''

''کیسا اشارہ؟'' میں نے چونک کر کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔

''میرا ایک دوست ہے سعید......'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''گاؤں میں وہ سعیدو نائی کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ پینو کل دن میں لگ بھگ گیارہ بجے جی ٹی روڈ پر کھڑی تھی......''

''اوہ......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ''کیا سعیدو نائی نے خود اپنی آنکھوں سے پینو کو جی ٹی روڈ پر کھڑے دیکھا تھا؟''

''اس سلسلے میں وہ پُر وثوق نہیں ہے ملک صاحب۔'' کانسٹیبل نے سرسری انداز میں کہا۔

''اس کا کیا مطلب ہوا......؟''

''مطلب یہ کہ سعیدو نے پینو کی ایک جھلک دیکھی تھی۔'' حیدر علی نے جواب دیا۔ ''وہ اپنی سائیکل پر جا رہا تھا تو پینو اسے روڈ کے کنارے کھڑی نظر آئی۔ اس نے گرم چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ سعیدو کی اس پر اچٹتی سی نگاہ پڑی تھی۔ اس کا خیال ہے کہ وہ پینو تھی مگر وہ صد فیصد یقین کے ساتھ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا......''

''اتنا بھی کافی ہے......'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس کے علاوہ اور کوئی خاص بات؟''

''نہیں جناب......'' اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔ ''ویسے میں نے سعیدو نائی سے کہہ دیا ہے کہ وہ اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھے اور پینو کے بارے میں جیسے ہی کوئی بات پتا چلے، وہ فوراً مجھے اطلاع دے۔''

''ویری گڈ......!'' میں نے ستائشی نظر سے کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔ ''یہ تم نے بہت اچھا کیا حیدر علی۔''

تھوڑی دیر کے بعد میں نے کانسٹیبل جنید خان کو اپنے ساتھ لیا اور ہم ایک تانگے پر سوار ہو کر چمن آباد کی جانب

روانہ ہوگئے۔ جب ہم مشتاق کے گھر پہنچے تو دن کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے لیکن ابھی تک سورج چاچو نے اپنا دیدار نہیں کرایا تھا۔

میں اس پروگرام کے تحت چمن آباد پہنچا تھا کہ مشتاق اور خالدہ سے پوچھ تاچھ کے بعد میں شاہ جی کے آستانے کا رخ کروں گا مگر وہاں پہنچ کر جو حالات پیش آئے انہوں نے میرے منصوبے کی ترتیب کو بدل کر رکھ دیا۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، چمن آباد ٹیکسٹائل ملز کے عقب میں واقع تھا۔ جی ٹی روڈ کے کنارے پر موجود ''راسکو'' انڈسٹریز اور ''زیبائش'' ٹیکسٹائل ملز کے بیچ میں سے ایک نیم پختہ راستہ چمن آباد کی طرف جاتا تھا اور یہ گاؤں ان فیکٹریوں کے پچھواڑے آباد تھا۔ ہمارا تانگا جیسے ہی گاؤں کے اندر داخل ہوا، میں نے گاؤں کے مین بازار میں ایک ٹھیلے والے کو دیکھ کر کوچوان سے کہا۔

''علی محمد! ذرا تانگا روکنا......''

گاؤں کے ''مین بازار'' سے کہیں آپ کسی بھرے پُرے بارونق بازار یا مارکیٹ کا تصور نہیں کرلیجیے گا۔ میں نے اس نیم پختہ راستے کا ذکر کیا ہے جو جی ٹی روڈ سے نکل کر چمن آباد کے قلب تک جاتا تھا۔ اس راستے پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مختلف قسم کی دکانیں موجود تھیں اور کہیں کہیں سبزی، پھل اور دیگر اشیائے ضرورت کے ٹھیلے کھڑے دکھائی دیتے تھے۔ میں نے جس ٹھیلے کے نزدیک تانگا رکوایا، وہاں پر ایک سیاہ رو، پستہ قامت شخص سموسے اور پکوڑے بیچ رہا تھا۔ گزشتہ شام تھانے میں مشتاق اور اس کی بیوی سے میری جو گفتگو ہوئی تھی وہ میرے ذہن میں تروتازہ تھی۔ یہی سبب تھا کہ اس سموسے پکوڑے فروش پر نگاہ پڑتے ہی میرے تصور میں اعجاز عرف جاجو کا نام چمکا تھا۔

میں تانگے سے اترا اور ٹہلنے والے انداز میں چلتے ہوئے مذکورہ ٹھیلے کے نزدیک پہنچ گیا۔ میں اس وقت سرکاری وردی میں تھا اور تانگے میں موجود کانسٹیبل جنید خان نے بھی یونیفارم پہن رکھی تھی۔ وہ ٹھیلے والا تانگے کو رکتے دیکھ چکا تھا اور اس کے اندر کانسٹیبل کو بھی، اور جب میں اس کے قریب پہنچا تو وہ یکدم اٹین شین ہوگیا اور بصد احترام بولا۔

''ست بسم اللہ سرکار...... تھانے دار صاحب تشریف لائے ہیں......''

''تم جاجو ہی ہونا......؟'' میں نے تصدیق طلب انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''جی سرکار!'' وہ اپنی گردن کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''حکم کریں جی، میں آپ کی کیا خدمت کروں۔ میرے پاس پیش کرنے کے لیے یہ سموسے اور پکوڑے ہی ہیں۔''

''تم ایک اور خاص چیز کو بھول رہے ہو جاجو......!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑ کر سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ گھبرا گیا اور فکرمندی سے پوچھا۔ ''وہ کیا جی؟''

''اس خاص چیز کا نام ہے، اعجاز عرف جاجو......!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''یہ...... یہ...... آپ کیا کہہ رہے ہیں حضور......؟'' وہ حد درجہ الجھے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''کیا یہ غلط ہے کہ تم مشتاق سائیکلوں والے کی بیٹی پروین عرف پینو کو پسند کرتے ہو؟'' میں نے جاجو کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''اور اس سے شادی کرنا چاہتے ہو......؟''

پینو کے ذکر پر جاجو کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ وہ یکایک بہت زیادہ حواس باختہ نظر آنے لگا تھا۔ میں مسلسل سوالیہ نظر سے اسے گھور رہا تھا۔ چند لمحات کے تذبذب کے بعد وہ لکنت زدہ لہجے میں بولا۔

''جی...... نن...... نہیں...... ہاں...... جی......''

''ایک جواب دو......'' میں نے کرخت انداز میں کہا۔ ''ہاں یا نہیں؟''

''ہا...... ں ں ں......'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''پیار کرنا...... کوئی جرم تو نہیں تھانے دار صاحب...... اور نہ ہی کسی سے شادی کی خواہش رکھنا کوئی گناہ......!''

''میں تمہارے فلسفے سے اتفاق کرتا ہوں جاجو!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن پیار کی چاہت اور شادی کی خواہش میں اگر اپنے محبوب کو غائب کردیا جائے تو پھر یہ سنگین عمل جرم بن جاتا ہے اور یقیناً گناہ بھی......!''

''میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا......'' وہ بے بسی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''پتا نہیں، آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔ کہیں آپ......'' اس نے چونک کر بے یقینی سے مجھے دیکھا اور اضطراری لہجے میں بولا۔ ''کہیں آپ یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ پینو کی گمشدگی میں میرا کوئی ہاتھ ہے......!''

''تو کیا ایسا نہیں ہے......؟'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''ہرگز نہیں جی!'' وہ چٹانی لہجے میں بولا۔ ''میں اس

قسم کی گھٹیا حرکت نہیں کر سکتا جناب۔ میں نے تو بڑے ادب آداب کے ساتھ چاچا مشتاق سے درخواست کی تھی مگر اس نے مجھے ٹال دیا......''

''اور اس کے بعد پینو اچانک گم ہو گئی......؟'' میں نے جاجو کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ہیں نا......!''

''نہیں سرکار......'' وہ گردن کو نفی میں جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''میں اپنے مرے ہوئے باپ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ پینو کی گمشدگی میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ مجھے تو خود کل رات میں پتا چلا ہے کہ پینو اچانک کہیں غائب ہو گئی ہے......!''

''قسمیں زندہ لوگوں کی کھائی جائیں یا گزر جانے والوں کی، اس سے پولیس والوں کا دل نہیں پگھلتا جاجو......'' میں نے اسے خطرناک نظر سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''اور تمہیں کل رات کو اس لیے پتا چلا کہ تم کل کا پورا دن چمن آباد میں تھے ہی نہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جی......'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اماں نے اپنے کسی کام سے مجھے گکھڑ منڈی بھیجا تھا۔''

''تم کس کام سے گکھڑ منڈی گئے تھے؟'' میں نے اس کے چہرے اور آنکھوں میں نمودار ہونے والے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''اور اپنے گھر سے کتنے بجے روانہ ہوئے تھے۔''

''ادھر گکھڑ منڈی میں میری خالہ شمشاد رہتی ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اماں نے کچھ کپڑے اور دیگر چھوٹا موٹا سامان اپنی بڑی بہن کے لیے بھجوایا تھا اور میں لگ بھگ دس بجے صبح گھر سے نکلا تھا اور گیارہ بجے سے پہلے خالہ شمشاد کے گھر پہنچ گیا تھا۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہ ہو تو آپ میری اماں سے پوچھ لیں۔''

موضع چمن آباد سے گکھڑ منڈی کا فاصلہ کم و بیش آٹھ میل تھا۔ اس حساب سے وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اگر وہ کسی تانگے پر سوار ہو کر گکھڑ منڈی گیا تھا تو اسے اتنا ہی وقت لگنا تھا۔

''تمہاری اماں سے پوچھنے کا کوئی فائدہ نہیں جاجو......'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ بات تو میں معلوم کر چکا ہوں کہ گزشتہ روز یعنی بائیس فروری کو تم صبح دس بجے سے شام پانچ بجے تک چمن آباد میں موجود نہیں تھے۔ میں تو اپنا ایک بندہ سیدھا گکھڑ منڈی تمہاری خالہ شمشاد کے پاس بھیجوں گا جو واپس آ کر مجھے بتائے گا کہ تم گزشتہ روز گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان اپنی خالہ کے گھر میں تھے یا نہیں؟''

جاجو نے نہ سمجھنے والے انداز میں پلکیں جھپکائیں اور خاصے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان کا کیا مطلب ہوا سرکار؟''

''یہ وہ وقت ہے جب پینو اچانک چمن آباد سے غائب ہو گئی تھی۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''بات سمجھ میں آئی کہ نہیں؟''

''جی، سمجھ گیا......'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''آپ کا جیسے دل چاہے، تصدیق کر لیں۔ آپ مجھے اس معاملے میں ملوث نہیں پائیں گے۔''

جاجو کے آخری جملوں سے بے پناہ اعتماد جھلکتا تھا۔ وہ شکل اور قد کاٹھ کا جیسا بھی سہی مگر اس کی گفتگو کے انداز میں بڑی معقولیت پائی جاتی تھی۔ میرے پیشہ ورانہ تجربے نے مجھے بتا دیا کہ جاجو نے مجھ سے کوئی غلط بیانی نہیں کی تھی۔

''تمہارا گھر کس طرف ہے جاجو؟'' میں نے پوچھا۔

وہ ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اُدھر دوسری گلی میں۔''

پھر اس نے بتایا کہ اس کے والد حفیظ اللہ کا کچھ عرصہ پہلے انتقال ہو گیا تھا اور وہ اپنی ماں ارشاد بی بی کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کا اور کوئی بھائی یا بہن نہیں۔ ارشاد بی بی کا بھی دنیا میں صرف ایک ہی رشتے دار تھا اور وہ تھی اس کی بڑی بہن شمشاد بی بی گکھڑ منڈی والی۔ شمشاد بی بی کے شوہر امان اللہ کی ادھر گکھڑ منڈی میں دریوں کی دکان تھی۔ شمشاد اور امان اللہ کی ایک ہی بیٹی تھی جس کا نام مریم تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اپنی اکلوتی بیٹی مریم کی شادی اعجاز عرف جاجو سے کر دیں اور جاجو کا دل پینو میں اٹکا ہوا تھا۔

''تم سارا دن ٹھنڈے پکوڑے اور سموسے ہی بیچتے رہتے ہو یا کسی گاہک کو تازہ بھی تل کر دیتے ہو؟'' میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''یہ تو جی گاہک گاہک پر منحصر ہے۔'' وہ بڑی سادگی سے بولا۔ ''اگر آپ جیسا کوئی گاہک آجائے تو اس کے لیے گرما گرم نکال کر دیتا ہوں۔''

''اچھا......!'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''کیا تم ادھر ہی کھڑے ہو کر کاروبار کرتے ہو یا گھوم پھر کر سموسے اور پکوڑے بیچتے ہو؟''

''یہی میرا مستقل ٹھکانا ہے تھانے دار صاحب۔'' اس نے بتایا۔ ''میں روزانہ ادھر ہی ٹھیلا لگاتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے......'' میں نے کہا۔ ''اگر واپسی میں

ادھر سے میرا گزر ہوا تو میں تمہارے پکوڑے اور سموسے ضرور چیک کروں گا......“

وہ میری بات سے کچھ اور ہی سمجھا۔ جلدی سے بولا۔ ”آپ کا جب دل چاہے، میرے سامان کو چیک کر سکتے ہیں۔ اس سموسوں اور پکوڑوں میں استعمال ہونے والا بیسن، میدہ، گھی اور دیگر مسالا جات ایک دم اصلی اور معیاری ہیں۔“

میں نے جس پیرائے میں ”چیک کروں گا“ کے الفاظ استعمال کیے تھے وہ جاجو کی کھوپڑی میں جگہ نہیں بنا پائے تھے۔ میں نے بھی اسے سمجھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور تانگے میں جا بیٹھا۔ اگلے ہی لمحے کوچوان علی محمد نے تانگا آگے بڑھا دیا۔

☆☆☆

مشتاق کا گھر گاؤں کے وسط میں، نیم پختہ راستے کے کنارے پر واقع تھا۔ میں نے جس نیم پختہ راستے کا ذکر کیا ہے وہ دراصل موضع چمن آباد کے بیچوں بیچ گزر کر ریلوے لائن تک چلا جاتا تھا۔ ریلوے لائن کی دوسری جانب سرسبز وشاداب کھیتوں کا سلسلہ تاحدِ نگاہ پھیلا ہوا تھا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو مشتاق اپنی دکان میں موجود تھا۔

وہ سات مرلے (لگ بھگ ایک سو ساٹھ گز) کا مکان تھا۔ مشتاق نے ہمارے تانگے کو اپنی دکان کے سامنے رکتے دیکھا تو اٹھ کر ہمارا استقبال کیا اور بڑے ادب سے بولا۔

”اچھا ہوا آپ آگئے۔ میرا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ کیا میری پینو کا کچھ پتا چلا؟“

بات کے اختتام پر وہ امید بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے کہا۔

”مشتاق! میں تمہارے دل کی گھبراہٹ دور کرنے کے لیے ہی یہاں آیا ہوں۔ تمہاری بیٹی کا ایک سراغ تو ملا ہے لیکن پینو تک پہنچنے کے لیے مجھے تمہارے بھرپور تعاون کی ضرورت ہوگی۔ کیا ہم گھر کے اندر بیٹھ کر اطمینان سے بات کر سکتے ہیں......!“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں جناب......“ وہ جلدی سے بولا۔ ”آپ آئیں میرے ساتھ۔“

میں نے کوچوان علی محمد کو ہدایت کی کہ وہ تانگے میں موجود رہے اور کانسٹیبل جنید خان سے کہا کہ وہ گھوم پھر کر پینو کی گمشدگی کے حوالے سے سن گن لینے کی کوشش کرے اور میں خود مشتاق کے ساتھ گھر میں داخل ہو گیا۔

بیوی

دنیا کے 2 مشکل ترین کام۔ (1) اپنا آئیڈیا کسی دوسرے کے دماغ میں منتقل کرنا۔ (2) کسی دوسرے کا مال اس کی جیب سے اپنی جیب میں منتقل کرنا۔ جو شخص پہلے کام میں کامیاب ہو جائے، اسے ٹیچر کہتے ہیں اور جو دوسرے کام میں کامیاب ہو اسے بزنس مین کہتے ہیں اور جو دونوں کاموں میں کامیابی حاصل کر لے اسے بیوی کہتے ہیں۔

☆☆☆

برابر

جرمنی میں اساتذہ کو تمام دیگر پیشوں میں کام کرنے والوں سے زیادہ تنخواہ ملتی ہے۔ پچھلے دنوں ڈاکٹرز، انجینئرز، ججز وغیرہ نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ ان کو بھی اساتذہ کے برابر تنخواہ دی جائے۔ جب یہ مطالبہ جرمنی کی چانسلر انجیلا مورکل کے علم میں آیا تو انہوں نے کہا کہ میں آپ لوگوں کو ان لوگوں کے برابر کیسے کردوں۔ جن قابلِ احترام لوگوں کی وجہ سے آپ اپنے موجودہ مقام پر کھڑے ہیں اور معاشرے میں باعزت زندگی گزار رہے ہیں۔

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، حیدر آباد

اندر مشتاق کی بیوی خالدہ بھی موجود تھی۔ انہوں نے مجھے صحن میں بچھی ایک چارپائی پر بٹھایا اور میرے سامنے دست بستہ کھڑے ہو گئے۔ مشتاق نے پوچھا۔

”تھانے دار صاحب! آپ کو پینو کا کون سا سراغ ملا ہے؟“

”پہلے تم دونوں بھی بیٹھ جاؤ“ میں نے کہا۔ ”پھر بات کرتے ہیں۔“

مشتاق نے جلدی سے نزدیک ہی دوسری چارپائی بھی بچھا دی۔ خالدہ میری خاطر تواضع کے ذیل میں سرگرمی دکھانا چاہتی تھی لیکن میں نے بڑے واضح الفاظ میں اسے سختی سے منع کر دیا۔ وہ دونوں میرے سامنے دوسری چارپائی پر بیٹھ گئے اور ان کی سوالیہ نظریں مجھ پر جم گئیں۔

”میری بات کو دھیان سے سنو۔ مجھے جو سراغ ملا ہے وہ بھی اسی جانب اشارہ کرتا ہے کہ پینو اپنی مرضی سے کہیں گئی ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”وہ کل ٹھیک گیارہ بجے دن میں جی ٹی روڈ کے کنارے کھڑی دیکھی

گئی ہے۔اس نے گرم چادر کی بکل مار رکھی تھی۔''

''مجھے تو اسی کمینے پر شک ہے جی......'' خالدہ نے نفرت بھرے انداز میں کہا۔''وہ کل سارا دن گاؤں میں نہیں تھا۔اسی نے میری بچی کو کہیں گم کر دیا ہے۔آپ اسے گرفتار کرکے چھترول کریں گے تو وہ سب کچھ اپنی زبان سے قبول کرلے گا۔''

میں پلک جھپکتے میں خالدہ کی بات کی تہ میں اتر گیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ اس کا اشارہ کس طرف تھا تاہم پھر بھی تصدیق کی خاطر پوچھ لیا۔

''خالدہ بی بی!تم کس کمینے کی بات کر رہی ہو؟''

''وہی لنگورجی جو مشتاقے کے پاس بیٹھ کر گپیں لگاتا رہتا ہے۔'' وہ بیزاری سے بولی۔''میں جاجو کی بات کر رہی ہوں۔''

''تم بالکل غلط انداز میں سوچ رہی ہو خالدہ بی بی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔''میں نے اچھی طرح تفتیش کرلی ہے۔جاجو کا پینو کی گمشدگی میں کوئی ہاتھ نہیں۔''

''وہ بے چارہ رات کو بھی مجھ سے ملنے آیا تھا اور صبح بھی ادھر کا ایک چکر لگا کر گیا ہے۔'' مشتاق نے غم زدہ آواز میں بتایا۔''اسے بھی پینو کے اچانک غائب ہوجانے کا بڑا دکھ ہے۔''

''اگر جاجو پینو کی گمشدگی میں ملوث نہیں تو پھر وہ کہاں غائب ہوگئی ہے؟'' خالدہ نے براہِ راست مجھ سے سوال کیا۔

''وہ جہاں بھی گئی ہے اسے وہاں سے واپس لانے کے لیے ہی تو یہ ساری تگ و دو کی جارہی ہے۔'' میں نے باری باری ان دونوں میاں بیوی کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔''یہ تو پتا چل گیا ہے کہ وہ جہاں بھی گئی ہے، اپنی مرضی سے گئی ہے۔وہ اکیلی گئی ہے یا کسی کے ساتھ، یہ معلوم کرنا باقی ہے اور اسی سلسلے میں مجھے آپ لوگوں کا تعاون درکار ہے۔آپ کی مدد کے بغیر میں پینو کو بازیاب نہیں کرسکوں گا......''

''ہم تو ہر قسم کا تعاون کر رہے ہیں آپ کے ساتھ۔'' خالدہ نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔''بتائیں،اور کیا کریں؟''

''مجھے صرف ایک سوال کا جواب چاہیے۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔''کیا پینو کا گاؤں کے کسی بندے کے ساتھ کوئی چکر تھا......کیا وہ کسی کو پسند کرتی تھی؟''

''ایسی کوئی بات میرے علم میں نہیں ہے تھانے دار صاحب!'' مشتاق نے بے بسی سے کہا۔

خالدہ بولی۔''بالکل نہیں جی۔آپ غلط انداز میں سوچ رہے ہیں۔پینو اگر کسی خاص بندے کو پسند کر رہی ہوتی تو یہ بات مجھ سے چھپ نہیں سکتی تھی۔''

''تو پھر کہیں......'' میں نے خالدہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔''پینو کو گلزار نے تو غائب نہیں کر دیا......؟''

''کون گلزار......؟'' مشتاق بے ساختہ بول اٹھا۔

''میں اس مسلم جن کی بات کر رہا ہوں جو تمہاری لاڈلی بیٹی پینو پر عاشق ہوگیا تھا......'' میں نے مشتاق کے سوال کے جواب میں کہا۔

خالدہ کا چہرہ یک دم پیلا پڑ گیا۔وہ صدیوں کی بیمار نظر آنے لگی۔میں نے تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''تمہیں یہ اچانک کیا ہوگیا خالدہ بی بی۔تم اس قدر گھبرا کیوں گئی ہو؟''

''وہ جی......میں آج صبح شاہ جی کے آستانے پر گئی تھی۔'' وہ ڈری سہمی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔''میں پینو کے لیے بہت پریشان تھی اس لیے وہاں چلی گئی تھی......''

''پھر شاہ جی نے پینو کی گمشدگی کے حوالے سے کیا کہا؟'' میں نے پوچھا۔

''انہوں نے بھی ایسی ہی بات کی ہے جیسی آپ کر رہے ہیں۔'' وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔''وہ کہہ رہے تھے، یہ جنات بہت خبیث اور کمینے ہوتے ہیں۔یہ ناری مخلوق ہے۔ان سے خیر کی توقع نہیں رکھنا چاہیے۔یہ کسی وقت کچھ بھی کر سکتے ہیں۔یہ جس کسی انسان پر بھی آجاتے ہیں، پھر آسانی سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔انہیں مستقل طور پر دفع دور کرنے کے لیے باقاعدہ علاج بہت ضروری ہے......''

لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر شاہ جی کے فرمودات کو مکمل کرتے ہوئے بتایا۔

''شاہ جی نے کہا ہے......خالدہ بی بی!اگر تم نے میری بات مان لی ہوتی تو آج تمہیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔مجھے یقین ہے کہ گلزار ہی پینو کو اپنے ساتھ کہیں لے گیا ہے۔بس دعا کرو کہ وہ نامراد پینو کو کوئی نقصان نہ پہنچائے......!''

''پہلی بات تو یہ کہ بقول شاہ جی، گلزار نامی وہ جن پینو پر عاشق ہے۔'' میں نے خالدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''دوسری بات یہ کہ دنیا کا کوئی بھی عاشق انسان یا جن اپنی معشوقہ کو نقصان پہنچانے کا تصور نہیں کرسکتا۔تیسری بات یہ کہ آج تک یہ سننے میں نہیں آیا کہ کسی عاشق جن نے اپنی معشوقہ کو یوں اغوا کیا ہو اور چوتھی بات یہ کہ......'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

میری تقلید میں وہ دونوں میاں بیوی بھی کھڑے ہوگئے۔ میں نے چوتھی بات کے ذیل میں، سپاٹ آواز میں پوچھا۔ ''کیا پینو اکیلی سوتی تھی یا آپ میں سے کسی کے ساتھ؟''

''وہ اپنے کمرے میں اکیلی ہی سوتی تھی سرکار۔'' مشتاق نے بتایا۔ ''ہم میاں بیوی دوسرے کمرے میں سوتے ہیں۔''

مکانیت کے اعتبار سے مشتاق کا گھر چار کمروں پر مشتمل تھا۔ مکان کے عقبی حصے میں دو کشادہ کمرے پہلو بہ پہلو واقع تھے جن کے آگے برآمدہ بنا ہوا تھا۔ اسی طرح گھر کے سامنے والے حصے میں بھی دو کمرے بنے ہوئے تھے جن میں سے ایک میں مشتاق نے سائیکلوں والی دکان کھول رکھی تھی جبکہ دوسرا کمرا بند تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق وہ بند کمرا گھر کی بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا۔ ان چاروں کمروں کے درمیان ایک کشادہ صحن واقع تھا جہاں پر اس وقت میں موجود تھا۔ صحن کی ایک دیوار کے ساتھ باورچی خانہ اور دوسری دیوار کے ساتھ نہانے اور کپڑے وغیرہ دھونے والا باتھ روم بنا ہوا تھا۔

''میں پینو کا کمرا دیکھنا چاہتا ہوں......!'' میں نے کہا۔

''آپ آئیں میرے ساتھ۔'' مشتاق نے کہا۔ ''میں آپ کو پینو کا کمرا دکھا دیتا ہوں۔''

مکان کے عقبی حصے میں تعمیر شدہ دو کمروں میں سے ایک مشتاق اور اس کی بیوی خالدہ کے تصرف میں تھا جبکہ دوسرے کمرے میں پروین عرف پینو کا بسیرا تھا۔ وہ دونوں بھی میرے ساتھ ہی پینو کے کمرے میں پہنچ گئے۔

میں نے تنقیدی نگاہ سے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ چارپائی بچھی ہوئی تھی اور اس چارپائی کے اوپر بستر بھی لگا ہوا تھا۔ دروازے کے ساتھ ہی ایک دیوار کے پاس چھوٹی سی چوبی میز بھی رکھی ہوئی تھی جس پر کنگھی، شیشہ اور دو چار خواتین کے بناؤ سنگار کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی شے میرے کام کی نہیں تھی۔ ایک فوری خیال کے تحت میں نے پینو کی چارپائی کے نیچے جھانک کر دیکھا تو وہاں پر مجھے ایک صندوق رکھا نظر آیا۔ میں نے مذکورہ جستی صندوق کو کھینچ کر باہر نکال لیا۔

خالدہ نے کہا۔ ''پینو اس صندوق میں اپنے کپڑے وغیرہ رکھتی تھی۔''

میں نے مشتاق سے پوچھا۔ ''کیا میں اس صندوق کو کھول کر دیکھ سکتا ہوں؟''

''بے شک جناب......'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ ضرور دیکھیں جی۔''

میں نے اس ڈیڑھ بائی تین فٹ کے جستی صندوق کو اٹھا کر چارپائی کے اوپر رکھا۔ صندوق کو تالا نہیں لگایا گیا تھا۔ بس اس کی دونوں سائڈ کی کنڈیاں بند تھیں۔ میں نے وہ کنڈیاں کھول کر صندوق کا ڈھکنا اٹھا دیا۔

صندوق کے اندر کا نظارہ کوئی خوشگوار نہیں تھا۔ ایک لحاظ سے اس صندوق کو خالی ہی کہا جا سکتا تھا۔ چند مڑے تڑے اخبارات کے سوا وہاں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جس طرح شفٹنگ کے بعد خالی گھر بے سروسامانی اور ویرانی کی تصویر بن جاتا ہے، بعینہٖ اس صندوق کو بھی ایسا ہی معاملہ درپیش تھا۔ لگتا تھا، صندوق کے اندر موجود سامان کو کہیں اور شفٹ کر دیا گیا تھا۔ میں صندوق کے کھلے ہوئے پیٹ کا بغور جائزہ لے ہی رہا تھا کہ خالدہ کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''پینو کے کپڑے کہاں گئے......صندوق تو خالی پڑا ہے......؟''

''خالدہ بی بی! اب تو تمہیں میری بات کا یقین آ گیا نا کہ پینو اپنی مرضی سے کہیں گئی ہے اور اپنے سارے کپڑے لتے بھی ساتھ لے گئی ہے۔'' میں نے گمشدہ پینو کی ماں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ اکیلی گئی ہے یا کسی کے ساتھ، بس یہ پتا چلانا باقی ہے اور جب مجھے اس سوال کا جواب مل گیا تو پھر پینو کو ڈھونڈ نکالنا مشکل نہیں رہے گا۔''

''یا اللہ! مجھ پر رحم فرما......'' مشتاق گلوگیر آواز میں بولا۔ ''میرے جگر کا ٹکڑا کہاں گم ہو گیا۔ میں پینو کے بغیر کیسے زندہ رہوں گا۔''

''کچھ تو خیال کر مشتاقے! تو مرد ہو کر آنسو بہا رہا ہے۔'' خالدہ نے گھور کر اپنے خاوند کی طرف دیکھا۔ ''میں پینو کی ماں ہوں اور اس کی گمشدگی کا مجھے بھی بہت زیادہ دکھ ہے لیکن میں نے ابھی تک صبر کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔''

''مجھے تو تھانے دار صاحب کی بات ٹھیک ہی لگ رہی ہے......'' وہ نحیف سی آواز میں بولا۔ ''تم پینو کی ماں تھیں۔ بیٹیاں اپنی ماں کے بہت قریب ہوتی ہیں۔ میں تو سارا دن دکان میں کام کرتا رہتا تھا۔ تمہیں چاہیے تھا کہ پینو پر کڑی نظر رکھتیں......!''

''مشتاقے! تم میرے سامنے یہ بات تو نہ کرو......'' وہ ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ ''تم نے کب مجھے پینو کے قریب ہونے دیا تھا۔ تم اس کی ہر جائز اور ناجائز بات مانتے تھے۔ میں کبھی کسی غلط بات پر روک ٹوک کرتی تو تم ہمیشہ اسی

کا ساتھ دیتے تھے اور مجھے دبکا مار کر چپ کرا دیا کرتے تھے۔ وہ میری نتی کب تھی جو میں اس پر نظر رکھتی۔ تمہارے لاڈ پیار نے اسے ضدی اور خودسر بنا دیا تھا۔ اگر واقعی تھانے دار صاحب کی بات درست ہے تو پینو کی گمشدگی کے ذمے دار تم ہو مشتاقے...... صرف تم!"

"کسی پر الزام لگانا دنیا کا سب سے آسان کام ہے اللہ کی بندی......" مشتاق نے بے چارگی سے کہا۔ "میرے لاڈ پیار کا یہ مطلب تھوڑی تھا کہ وہ گھر سے بھاگ جائے۔ میں تو اپنی محبت سے مجبور ہو کر اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرتا تھا۔ وہ ہماری زندگی کی اکلوتی خوشی تھی۔ میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری لاڈو اتنا بڑا قدم اٹھائے گی......"

"اب تو وہ قدم اٹھ چکا مشتاقے......!" وہ اپنے نکیلے الفاظ سے شوہر کا سینہ چھلنی کرتے ہوئے بولی۔ "خالی صندوق چیخ چیخ کر اعلان کر رہا ہے کہ تمہاری لاڈو اپنی مرضی سے کہیں گئی ہے۔ اب تم کسی کونے میں بیٹھ کر اپنی محبت اور لاڈ پیار کا ماتم کرو مشتاقے......!"

ان میاں بیوی کی بحث و تکرار کو سماعت کرنے کے دوران میں، میں صندوق کے حالاتِ اندرونی کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لے رہا تھا۔ صندوق کے ڈھکنے والے حصے میں دونوں جانب پاکٹ کی طرز کے دو خانے بنے ہوئے تھے۔ ان جستی خانوں کی تلاشی بڑی سودمند ثابت ہوئی۔ ایک خانے کے اندر سے مجھے ایک تہ شدہ کاغذ ملا۔ میں نے فوراً مذکورہ کاغذ کو کھول کر دیکھا۔

وہ کسی طالب علم کی کاپی سے پھاڑا ہوا ایک عام سا صفحہ تھا جس پر صرف یک سطری تحریر رقم کی گئی تھی......

"کل ٹھیک گیارہ بجے، جی ٹی روڈ پر، مولوی کے کھوکھے کے سامنے......!"

اس مختصر سی تحریر نے میرے ذہن میں روشنی کا ایک تیز جھماکا کیا اور میں سیدھا کھڑا ہو گیا۔ گزشتہ شام تھانے میں خالدہ نے بڑے فخر سے مجھے بتایا تھا کہ اس کی بیٹی پانچ جماعتیں پاس ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اردو لکھنا اور پڑھنا جانتی تھی۔ میرے ہاتھ میں موجود کاغذ کی تحریر میں راقم کا نام درج نہیں تھا لیکن اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ اس تحریر کا خالق کوئی مرد ہو گا جس کے کہنے پر پینو اپنے کپڑے سمیٹ کر گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ اس مرد نے پینو کو مولوی کے کھوکھے کے سامنے جی ٹی روڈ پر آنے کو کہا تھا۔ اس تحریر میں "کل" کا لفظ استعمال ہوا تھا۔ پینو بائیس فروری کی صبح دس بجے سے دوپہر بارہ بجے کے درمیان گھر سے نکلی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تحریر اکیس فروری کو پینو تک پہنچائی گئی تھی۔ سعید وٹائی نے بائیس فروری کو دن گیارہ بجے پینو کو گرم چادر کی بکل مارے، جی ٹی روڈ کے کنارے کھڑے دیکھا تھا۔ مولوی کا کھوکھا "جنرل سرامکس لمیٹڈ" کے برابر میں، جی ٹی روڈ کے کنارے پر واقع تھا۔ "جی سی ایل" جنرل سرامکس لمیٹڈ میں پتھر اور مٹی کی فینسی اینٹیں تیار کی جاتی تھیں اور "مولوی کا کھوکھا" دراصل ایک ہوٹل تھا جہاں کے کھانے بہت لذیذ اور مشہور تھے۔

"یہ آپ کے ہاتھ میں کیسا کاغذ ہے تھانے دار صاحب؟" مشتاق نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

وہ دونوں میاں بیوی انگوٹھا ٹیک انسان تھے اس لیے وہ پرچہ انہیں دکھانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا لہٰذا میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"یہ رقعہ اس شخص کی طرف سے ہے جس کے ساتھ تمہاری بیٹی گئی ہے۔ اس میں پینو کے لیے یہ پیغام درج ہے...... کل ٹھیک گیارہ بجے، جی ٹی روڈ پر، مولوی کے کھوکھے کے سامنے۔"

"ہائے میرے یاربا...... یہ دن بھی دیکھنا تھا......" خالدہ اپنا سر پکڑ کر کمرے کے فرش پر بیٹھ گئی۔ "مشتاقے کی لاڈو نے تو ہمیں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا......"

"تھانے دار صاحب......!" مشتاق دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور منت ریز لہجے میں بولا۔ "آپ کسی بھی طرح جلد از جلد میری پینو کو ڈھونڈ نکالیں۔ میں اس ذلت اور رسوائی کو برداشت نہیں کر سکوں گا۔"

میں نے مناسب الفاظ میں ان دونوں کو تسلی دلاسا دیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں آخری بار پوچھ رہا ہوں۔ اگر پینو کا کسی کے ساتھ کوئی چکر تھا تو مجھے بتا دو......"

"ہم سچ کہتے ہیں جی......" وہ بیک زبان ہو کر بولے۔ "ہمارے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔"

"ٹھیک ہے......" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا پھر اس مختصر تحریر والے پرچے کو تہ کر کے اپنی جیب میں رکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ "اب میں خود ہی اس بندے کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

میں گمشدہ پینو کے کمرے سے نکل آیا۔ وہ دونوں بھی میرے ساتھ تھے۔ جب میں صحن کو عبور کر رہا تھا تو مشتاق کی دکان کے برابر والے بند کمرے کو دیکھ کر میں نے سرسری انداز میں استفسار کیا۔

''یہ تم لوگوں کی بیٹھک ہے نا......؟''

''نہیں جی......'' مشتاق نے جواب دیا۔ ''یہ کمرا ہم نے کرائے پر دیا ہوا ہے۔''

''لیکن میں نے تو اس کمرے کو اندر اور باہر سے بند دیکھا ہے......!'' میں نے الجھن زدہ نظر سے مشتاق کی طرف دیکھا۔ ''تم نے یہ کمرا کس کو کرائے پر دے رکھا ہے اور اس بندے نے کس چیز کی دکان کھولی ہوئی ہے؟''

''اس بندے کا نام ماجد ہے تھانے دار جی۔'' مشتاق کے بجائے خالدہ نے جواب دیا۔ ''اور ماجد نے یہاں کوئی دکان شکان نہیں کھول رکھی بلکہ وہ خود اس کمرے میں رہتا ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا......'' میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''میں بتاتا ہوں جی......'' مشتاق وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''بات یہ ہے جی کہ ماجد کا تعلق چک بیالی (بیالیس) شرقی سے ہے۔ وہ ادھر ''زیبائش'' ٹیکسٹائل ملز میں کام کرتا ہے اور ہم نے یہ کمرا ماجد کو کرائے پر، رہائش کے لیے دے رکھا ہے۔''

''اوہ......'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ''تو اس وقت ماجد فیکٹری گیا ہوگا......'' میں نے باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اسی لیے یہ کمرا بند ہے؟''

''نہیں جی...... ماجد تو اپنے پنڈ گیا ہوا ہے۔'' خالدہ نے بتایا۔

''ماجد کب چک بیالیس شرقی گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

مشتاق نے بتایا۔ ''وہ دو دن پہلے اپنے گھر گیا ہے۔''

''یعنی اکیس تاریخ کو؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی، جی......'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آج تئیس تاریخ ہے۔ وہ دو دن پہلے دوپہر میں فیکٹری سے چھٹی کر کے آ گیا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ گاؤں میں اس کا بچہ بیمار ہے اس لیے اسے معمول سے ہٹ کر گھر چک بیالی شرقی جانا پڑ گیا ہے۔''

''اوہ...... تو ماجد شادی شدہ ہے؟''

''جی۔ اس کا ساڑھے تین سال کا ایک بیٹا بھی ہے...... طارق!'' مشتاق نے بتایا۔ ''ماجد کی شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں۔ اس کی بیوی کا نام گڈی (صغریٰ) ہے۔''

''کیا آپ دونوں میں سے کوئی بھی ماجد کی بیوی یا اس کے بیٹے سے ملا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں جی!'' خالدہ نے نفی میں گردن ہلا دی۔

مشتاق نے کہا۔ ''اپنے بیوی بچے کے بارے میں یہ ساری باتیں ہمیں ماجد نے ہی بتائی ہیں ورنہ ہم کبھی چک بیالی شرقی گئے ہیں اور نہ ہی ماجد کے گھر سے کبھی کوئی چمن آباد آیا ہے۔ ماجد ایک بھلا مانس انسان ہے۔ اس نے آج تک ہمیں کسی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ وہ بغیر مانگے ہر ماہ کی سات تاریخ کو ہمیں کرایہ دے دیتا ہے۔ اس کے رویے اور اخلاق کو دیکھتے ہوئے ہم نے اس کی ہر بات پر یقین کر لیا ہے۔''

''ماجد کتنے عرصے سے تمہارا کرایہ دار ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک سال سے زیادہ ہی ہو گیا ہے۔''

''وہ ہر ماہ کی سات تاریخ ہی کو کرایہ کیوں ادا کرتا ہے۔'' میں نے پوچھا۔ ''اس کا کوئی خاص سبب؟''

''اس کی وجہ یہ ہے کہ فیکٹری سے اسے ہر ماہ کی سات تاریخ کو تنخواہ ملتی ہے۔''

''کیا ماجد لکھنا پڑھنا جانتا ہے؟'' میں نے ایک اہم سوال کیا۔

''جی......!'' مشتاق نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ''اس نے مجھے یہی بتایا ہے کہ وہ آٹھ جماعتیں پاس ہے۔''

''ٹھیک ہو گیا......'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''مشتاق! تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھے بتایا ہے کہ اکیس فروری کی دوپہر ماجد کو معمول سے ہٹ کر اپنے گاؤں جانا پڑا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس کا معمول کیا ہے؟''

''ماجد کی فیکٹری میں اتوار کو ہفتہ وار تعطیل ہوتی ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ہر ماہ کی سات تاریخ کے بعد جو بھی ہفتے کا دن آتا ہے اسی روز ماجد دو دن (ہفتہ اور اتوار) کے لیے اپنے گھر والوں سے ملنے چک بیالی شرقی چلا جاتا ہے پھر اس کی واپسی سوموار کی صبح ہی ہوتی ہے۔ فیکٹری والوں نے اسے ہر ماہ ہفتے کے ایک دن کی چھٹی کرنے کی سہولت دے رکھی ہے......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''دو دن پہلے یعنی اکیس فروری کو سوموار کا دن تھا اور آج بدھ وار ہے۔ پھر سات تاریخ بھی ابھی کافی دور ہے اسی لیے میں نے کہا کہ وہ اس بار خلاف معمول اپنے گاؤں گیا ہے۔''

موضع چمن آباد سے چک بیالیس شرقی کم و بیش پندرہ میل تھا۔ یہ اتنا فاصلہ تھا کہ کوئی فیکٹری ورکر روزانہ اپنے گھر

سے کام پر آجا نہیں سکتا تھا۔ اسی وجہ سے ماجد زیبائش ٹیکسٹائل ملز کے عقب میں واقع چمن آباد میں مشتاق کے گھر کے ایک کمرے میں، کرایہ دار کی حیثیت سے آباد ہو گیا تھا اور مہینے میں ایک چکر وہ اپنے گھر کا لگا آتا تھا۔''

''مشتاق!'' میں نے گمشدہ پینو کے باپ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''ماجد ٹیکسٹائل فیکٹری میں کام کیا کرتا ہے؟''

''وہ تانا ماسٹر ہے جناب!'' اس نے جواب دیا۔

ٹیکسٹائل انڈسٹری میں کام کے مختلف شعبے ہوتے ہیں جن میں نلکیاں بھرنا، تانیاں بنانا، کھڈی پر کپڑا بننا، کپڑے پر پرنٹنگ کرنا...... وغیرہ ہا! بنیادی شعبہ جات شمار کیے جاتے ہیں۔ ماجد ''زیبائش'' ٹیکسٹائل ملز میں تانا ماسٹر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ تانا مشین پر تانیاں بنایا کرتا تھا۔ تانی، کھڈی پر چڑھتی ہے تو اس کے بعد ہی کپڑے کی بُنائی کا عمل شروع ہوتا ہے۔

میں نے مشتاق اور خالدہ کے چہرے پر نگاہ جما کر کریدنے والے انداز میں سوال کیا۔ ''کیا ماجد کا پینو سے ملنا جلنا تھا؟''

''جی...... ہم تینوں سے اس کا ملنا جلنا ہے۔'' مشتاق نے اثبات میں جواب دیا۔

خالدہ نے کہا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ ماجد ہمارا کرایہ دار ہے لیکن وہ گھر کے ایک فرد کی طرح یہاں رہتا ہے۔ اکثر ہم اسے کھانے پینے کی چیزیں بھی دیتے رہتے ہیں۔''

''اور یہ سامانِ خورونوش پینو اسے پہنچایا کرتی تھی......!'' میں نے معنی خیز نظر سے خالدہ کی طرف دیکھا۔ ''ہیں نا؟''

''کبھی پینو اور کبھی میں۔'' وہ بڑی سادگی سے بولی۔

''ماجد نے کب تک واپس آنے کو کہا تھا؟''

''کہہ رہا تھا، ایک دو دن میں لوٹ آؤں گا۔'' مشتاق نے بتایا۔

''مگر دو دن تو گزر گئے اور وہ آیا نہیں......!'' میں نے کہا۔

''اللہ خیر کرے۔'' خالدہ تشویش بھرے لہجے میں بولی۔ ''اس کے بیٹے کی طبیعت ٹھیک ہو......!''

''آمین!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تم دونوں کے تعاون کا بہت شکریہ۔ آپ لوگوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں بہت جلد پینو کو ڈھونڈ نکالوں گا۔''

''یہ آپ کا ہم دونوں پر عظیم احسان ہوگا تھانے دار جی۔'' خالدہ تشکر بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''آپ لوگوں کو پینو کے بارے میں کوئی بھی نئی بات پتا چلے تو سیدھا تھانے آ کر مجھے بتانا ہے۔'' میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔

مشتاق جلدی سے سر کو اثبات میں حرکت دیتے ہوئے فرماں برداری سے بولا۔ ''جی...... ضرور......!''

میں مشتاق کے گھر سے باہر نکل آیا۔ کوچوان علی محمد اور کانسٹیبل جنید خان تانگے میں موجود تھے۔ میں بھی تانگے پر سوار ہو چکا تو کوچوان نے پوچھا۔

''ملک صاحب! واپس تھانے ہی جانا ہے نا؟''

''تم تانگے کو چمن آباد سے نکال کر جی ٹی روڈ پر پہنچو، پھر بتاتا ہوں......'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اچھا جی۔'' کہتے ہوئے علی محمد نے تانگا آگے بڑھا دیا۔ ''جو آپ کا حکم ملک صاحب!''

ہمارا تانگا جب چمن آباد کے مین بازار سے گزرا تو اعجاز عرف جاجو لپک کر سامنے آ گیا پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے تانگا روکنے کے لیے کہا۔ کوچوان نے مجھ سے پوچھا۔

''کیا کرنا ہے ملک صاحب؟''

''تانگا روک دو......'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اس عاشق نامراد کی بھی سن لیتے ہیں۔''

تانگے کو رکتا دیکھ کر جاجو واپس اپنے ٹھیلے کی طرف گیا اور وہاں سے دو بھرے ہوئے خاکی تھیلے اٹھا لایا اور انہیں میری جانب بڑھاتے ہوئے بڑی چاہت سے بولا۔

''یہ گرما گرم پکوڑے اور سموسے میں نے خاص طور پر آپ کے لیے تیار کیے ہیں۔ ساتھ ہی انار دانے کی چٹنی بھی ہے۔ آپ کھائیں گے تو مزہ آ جائے گا۔''

اس خیال سے کہ اس کی دل شکنی نہ ہو، میں نے اس کے ہاتھ سے وہ بھرے ہوئے دونوں تھیلے لے لیے۔ ایک خاکی تھیلے میں کوئی درجن بھر تازہ بہ تازہ سموسے تھے اور دوسرے تھیلے میں آدھا سیر کے قریب گرما گرم پکوڑے تھے۔ دونوں تھیلوں کے اندر سے بڑی اشتہا انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ میں نے گھور کر جاجو کی طرف دیکھا پھر بغرضِ تفریح ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔

''ایک پولیس آفیسر کو رشوت پیش کر رہے ہو......؟''

''نن...... نہیں جی۔'' وہ ایک دم بوکھلا گیا۔ ''مائی باپ! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں......؟''

''میں تمہارے یہ پکوڑے اور سموسے معیار کی چیکنگ کے لیے لے جا رہا ہوں۔'' میں نے تفریح کے عمل کو

دراز کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یاد رکھو، میں اس کے بدلے اپنے پروگرام میں کوئی تبدیلی نہیں لاؤں گا۔ میرا ایک بندہ سیدھا گکھڑ منڈی جائے گا اور شام سے پہلے وہاں کی رپورٹ لاکر مجھے دے گا۔ اگر تمہارا بیان کسی بھی مرحلے پر غلط ثابت ہوا تو الٹا لٹکا کر تمہاری چمڑی ادھیڑ ڈالوں گا۔ میں تھانے دار ہوں ذرا وکھری ٹائپ کا......“

”پروا نہیں ہے سرکار۔“ وہ بے نیازی بھرے اعتماد سے بولا۔ ”آپ جس طرح چاہیں، اپنی تسلی کریں۔ اگر میں نے آپ سے کوئی جھوٹ بولا ہو تو آپ میری چمڑی ادھیڑیں یا مجھے جان سے مار ڈالیں، میں اف تک نہیں کروں گا۔“

جاجو کے ٹھوس اور پُراعتماد جواب نے ایک بات تو پایۂ ثبوت تک پہنچا دی کہ مجھے اس کے بیان کی تصدیق کے لیے کسی کو گکھڑ منڈی بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے مشاہدے، تجربے اور وجدان کی روشنی میں جاجو، پپنو کی گمشدگی میں ملوث نظر نہیں آتا تھا۔

☆☆☆

جی ٹی روڈ پر پہنچ کر میں نے تانگے کو ”زیبائش“ ٹیکسٹائل ملز کی جانب مڑوالیا اور اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”آپ لوگ ان گرما گرم سموسوں اور پکوڑوں سے دل کھول کر انصاف کریں۔ میں تھوڑی دیر فیکٹری کے اندر گزار کر آتا ہوں۔“

ان دونوں کو معلوم نہیں تھا کہ میری مشتاق اور خالدہ سے کس نوعیت کی گفتگو ہوئی تھی لہٰذا وہ ماجد نامی کسی تانا ماسٹر کی اسٹوری سے واقف نہیں تھے۔ کانسٹیبل جنید خان نے سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا اور بولا۔

”اور آپ......؟“

”بتایا تو ہے، مجھے زیبائش ملز میں ایک چھوٹا سا کام ہے......!“

”آپ یہ نہیں کھائیں گے؟“ اس نے خاکی تھیلوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اگر یہ ٹھنڈے ہوگئے تو ان کا مزہ باقی نہیں رہے گا۔“

”فی الحال سموسوں اور پکوڑوں سے لطف اندوز ہونے سے کہیں زیادہ اہم کام میرے سامنے ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں پہلے وہ کام نمٹالوں۔ اس کے بعد پیٹ پوجا کے بارے میں بھی سوچ لوں گا......“

میرے حتمی انداز کے بعد جنید خان نے مزید کوئی بات نہیں کی۔ میں تانگے سے اترا اور ٹہلنے والے انداز میں چلتے ہوئے زیبائش ملز کے گیٹ کی سمت بڑھ گیا۔

فیکٹری کا مالک بابو شفیق اس وقت آفس میں موجود نہیں تھا۔ میں سیدھا جا کر منشی سے ملا۔ کسی بھی کارخانے میں منشی کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ آپ اسے جدید دور کا جنرل منیجر سمجھ لیں۔ مالک کے بعد وہ سب سے زیادہ اہم تصور کیا جاتا ہے۔ زیبائش ملز کے منشی کا نام عبدالجبار تھا۔ عبدالجبار ایک ادھیڑ عمر دبلا پتلا اور سنجیدہ مزاج خوش اخلاق شخص تھا۔

منشی نے میرا پُرتپاک استقبال کیا اور میرے ”نہ، نہ“ کرنے کے باوجود بھی اس نے میری خاطر تواضع کے لیے چائے اور کیک منگوا لیے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا۔

”فرمائیں ملک صاحب! میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟“

”میں آپ کی فیکٹری کے ایک ورکر ماجد کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے چائے اور کیک سے انصاف کرتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ”میرے خیال میں، اس سلسلے میں آپ سے زیادہ مفید اور کوئی ثابت نہیں ہوسکتا......!“

”جی ضرور...... آپ حکم کریں۔“ وہ متانت بھرے لہجے میں بولا۔ ”میں آپ کی ہر نوعیت کی مدد کے لیے تیار ہوں۔ بس، آپ مجھے......“ لمحاتی توقف کرکے اس نے پُرتشویش نظر سے مجھے دیکھا اور ان الفاظ میں مستفسر ہوا۔ ”بس، آپ مجھے یہ بتادیں کہ سب خیریت تو ہے نا ملک صاحب......؟“

”ابھی تک تو خیریت ہی ہے جبار صاحب!“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”دعا کریں کہ آگے بھی خیریت ہی رہے......“

”اصل میں، کسی پولیس آفیسر کا چل کر آنا اور ہماری فیکٹری کے ایک ملازم کے حوالے سے چھان بین کرنا ذہن میں ہزاروں قسم کے خدشات کو جنم دیتا ہے۔“ وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ ”آپ میری بات تو سمجھ رہے ہیں نا؟“

”صد فیصد سمجھ رہا ہوں جبار صاحب......!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”فکر نہ کریں۔ اگر ماجد کسی معاملے میں ملوث نہیں تو پھر آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”لیکن پتا تو چلے کہ آخر معاملہ کیا ہے......“ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ابھی تک تو آپ نے کچھ بتایا ہی نہیں کہ آپ ماجد کے بارے میں کس طرح کی تفتیش کرنے آئے ہیں؟“

”بتاتا ہوں......“ میں نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

آئندہ دس منٹ میں، میں نے منشی عبدالجبار کو حقیقتِ حال سے پوری طرح آگاہ کردیا۔ اس نے پوری توجہ اور فکرمندی سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر ماجد کے بارے میں جو کچھ بتایا وہ سب وہی تھا جو مشتاق اور خالدہ کی زبانی مجھ تک پہنچ چکا تھا یعنی......سب ٹھیک ہے۔ ماجد ایک عظیم انسان ہے۔ اس کے کردار پر شک نہیں کیا جاسکتا۔ وغیرہ وغیرہ!

اب ترپ کا پتا پھینکنے کا وقت آگیا تھا۔ میں نے منشی عبدالجبار کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔ ''جبار صاحب! کیا آپ نے فیکٹری کے اندر ملازمین کے لیے کوئی حاضری رجسٹر بھی رکھا ہوا ہے جس پر ہر ورکر روزانہ اپنے دستخط کرتا ہو؟''

''نہیں ملک صاحب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ایسا کوئی نظام ہماری فیکٹری میں موجود نہیں ہے البتہ، ہر ماہ کی سات تاریخ کو جب تنخواہ دی جاتی ہے تو میں ایک رجسٹر پر اس کا باقاعدہ اندراج کرتا ہوں۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ بعض ملازمین نے ایڈوانس لیا ہوا ہوتا ہے جو ہر ماہ اپنی تنخواہ میں سے تھوڑا تھوڑا کٹواتے رہتے ہیں لہٰذا ان کا حساب رکھنا پڑتا ہے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' میں نے تعریفی انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا ماجد نے بھی کبھی ایڈوانس رقم لی ہے؟''

''نہیں جناب! اس کا ریکارڈ صاف ہے۔'' منشی نے بتایا۔

''ابھی آپ نے جس سیلری رجسٹر کا ذکر کیا، میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو......!''

''کوئی اعتراض نہیں ملک صاحب!'' وہ خوش اخلاقی سے بولا۔ ''میں ابھی آپ کو وہ رجسٹر دکھاتا ہوں۔''

پھر اس نے میری فرمائش پوری کردی۔ میں تنقیدی نظر سے اس سیلری رجسٹر کا جائزہ لینے لگا۔ اِکا دُکا کو چھوڑ کر باقی تمام ورکرز نے تنخواہ وصول کرتے ہوئے رجسٹر پر اپنے انگوٹھے کا نشان ثبت کیا ہوا تھا۔ جن اِکا دُکا افراد نے دستخط کیے ہوئے تھے، ان میں ماجد بھی شامل تھا۔ میں نے ماجد کے دستخط کا بغور معائنہ کیا لیکن دستخط کو دیکھ کر یہ اندازہ قائم کرنا آسان نہیں تھا کہ وہ یک سطری تحریر بھی ماجد کی لکھی ہوئی تھی۔

میں نے سیلری رجسٹر کو بند کرتے ہوئے منشی سے استفسار کیا۔ ''جبار صاحب! کیا آپ کے پاس ماجد کی تحریر کا کوئی نمونہ ہے؟''

ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے اثبات میں جواب

امید

اگر آپ سوچ رہے ہیں کہ حالات آپ کے موافق نہیں ہیں۔ ہر چیز آپ کے ہاتھوں سے نکل رہی ہے تو پریشان نہ ہوں بلکہ ایک بار اس درخت کے بارے میں ضرور سوچیں جو ایک ایک کرکے اپنے سارے پتے گنوا چکا ہے لیکن اس امید پر ثابت قدم کھڑا ہے کہ کوئی بات نہیں۔ بہار کے دن ضرور پلٹ کر آئیں گے اور وہ پھر سرسبز و شاداب ہوجائے گا۔

دیا۔ ''جی ہے۔''

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اضطراری لہجے میں کہا۔ ''میں وہ نمونہ دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''جی......ابھی دکھاتا ہوں۔'' اس نے شائستگی سے کہا پھر وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر ایک الماری کی جانب بڑھ گیا۔

زیبائش ٹیکسٹائل ملز کے آفس میں منشی عبدالجبار کی میز کی ایک جانب دیوار کے ساتھ ایک چوبی الماری رکھی ہوئی تھی جو یقیناً اس فیکٹری کے لیے ریکارڈ روم کی حیثیت کی حامل تھی۔ منشی چند منٹ تک اس الماری کے اندر کچھ تلاش کرتا رہا پھر ایک کاغذ کے ساتھ واپس لوٹا اور اس کاغذ کو میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

''ہمارے پاس ماجد کی یہ واحد تحریر ہے جو ایک یادگار کی حیثیت رکھتی ہے جس کا اپنا ایک خاص پس منظر ہے۔''

میں نے منشی کے ہاتھ سے وہ کاغذ لے لیا۔ مذکورہ کاغذ کی تحریر سے پتا چلا کہ وہ ایک ''تنخواہ میں اضافے'' کی درخواست تھی۔ میں نے اپنی جیب میں سے وہ یک سطری تحریر نکال لی جو گمشدہ پینو کے جستی صندوق میں سے مجھے ملی تھی۔ پھر میں باریک بینی سے ان دونوں تحاریر کا موازنہ کرنے لگا۔ اس دوران میں منشی عبدالجبار کی آواز بھی مسلسل میری سماعت تک رسائی حاصل کررہی تھی۔

''فیکٹری ملازمین کا کوئی بھی چھوٹا بڑا مسئلہ ہوتا ہے تو وہ براہِ راست مجھ سے بات کرتے ہیں۔'' وہ اپنی ہی دھن میں بولتا چلا جارہا تھا۔ ''اگر کسی کو تنخواہ بڑھوانا ہو تو وہ بھی مجھ ہی سے درخواست کرتا ہے۔ میں فیکٹری ورکرز کے مسائل کو بابوجی (شفیق صاحب) کے سامنے رکھتا ہوں کیونکہ وہ فیکٹری کے مالک ہیں۔ کسی بھی معاملے کا فائنل فیصلہ انہی کو کرنا ہوتا ہے لیکن اس بندے ماجد نے تو فیکٹری کی ایک نئی تاریخ لکھ ڈالی تھی۔ ان دنوں ماجد کی ماہوار تنخواہ چالیس روپے ہوا کرتی تھی۔ ماجد نے بابو شفیق کے نام ایک درخواست لکھی جس میں

اس نے نہایت ہی شائستہ الفاظ میں کہا کہ اس کی تنخواہ میں اضافہ کیا جائے اور پھر اس نے یہ درخواست براہِ راست بابو شفیق کو دے دی تھی......'' وہ اپنی سانس ہموار کرنے کے لیے تھا پھر بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''بابو جی کو ماجد کا یہ انداز بہت بھایا اور انہوں نے اس کی تنخواہ میں دس روپے کا اضافہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ہدایت کی کہ میں اس درخواست کو کسی فائل میں محفوظ کرلوں۔ اسی لیے تھوڑی دیر پہلے میں نے آپ سے کہا تھا کہ یہ تحریر ایک یادگار کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کا اپنا ایک خاص پس منظر ہے اور اب...... ماجد کی یہ تحریر آپ کے ہاتھ میں ہے ملک صاحب۔''

میں نے سیلری رجسٹر میں ماجد کے نام کے سامنے ''پچاس روپے'' لکھا دیکھا تھا۔ اب یہ راز کھلا کہ وہ رقم چالیس روپے سے پچاس روپے میں کیسے بدلی تھی۔ پچاس روپے ماہانہ تنخواہ کا سن کر آپ کو شدید حیرت ہو رہی ہوگی اور آپ میں سے بعض یہ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ ملک صاحب پتا نہیں، کس دنیا کی باتیں کرتے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ میں اسی دنیا کے گزرے ہوئے زمانے کا ذکر کر رہا ہوں اور میرا یہ دعویٰ ہے کہ اس زمانے میں ایک فیکٹری مزدور کی تنخواہ آج کے مزدور کی ماہانہ آمدنی سے کم از کم تین گنا زیادہ ہوا کرتی تھی۔ زیادہ حیران نہ ہوں۔ میں اس کا ثبوت بھی فراہم کر دیتا ہوں۔ جس دور میں ایک فیکٹری ورکر کی اوسط تنخواہ پچاس روپے ماہوار ہوا کرتی تھی تب سونا ساٹھ روپے تولہ (دس گرام) تل جایا کرتا تھا اور دس سے پندرہ روپے میں ایک متوسط خاندان کا مہینے بھر کا راشن خریدا جا سکتا تھا۔ آج سونے کے فی تولہ بھاؤ کو ذہن میں رکھ کر خود ہی اندازہ لگالیں کہ میں نے کیا غلط کہا ہے اور کیا درست!

''ملک صاحب! آپ تو ماجد کی درخواست کے اندر کھب کر ہی رہ گئے ہیں۔'' منشی عبدالجبار نے اپنی باتیں روک کر مجھ سے کہا۔ ''لگتا ہے، آپ اس کے اندر سے کچھ نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں......!''

''کچھ نہیں...... بہت کچھ جبار صاحب!'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا پھر ماجد کی درخواست اور پینو کے صندوق سے ملنے والے پرچے کو منشی کی جانب بڑھاتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ''لیکن آپ بھی میری برآمدات کو ملاحظہ کرلیں......!''

اس نے میرے ہاتھ سے دونوں کاغذات لے لیے پھر بغور ان کا تقابلی جائزہ لینے لگا۔ میں جس نتیجے پر پہنچا تھا، اس میں کسی شک وشبہے کی گنجائش ڈھونڈی نہیں جا سکتی تھی۔ چند لمحات کے بعد منشی جبار نے بھی میرے برآمد کردہ نتیجے کی توثیق کر دی، اس کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''ملک صاحب! یہ دونوں تحریریں تو بالکل ایک جیسی ہیں......!''

''یعنی آپ مانتے ہیں کہ یہ ایک لائن......'' میں نے پینو کے صندوق سے حاصل ہونے والے پرچے کی یک سطری تحریر پر انگلی رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ لائن بھی ماجد ہی کے ہاتھ سے لکھی گئی ہے؟''

''جی بالکل!'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''دونوں تحریروں میں ذرا سا بھی فرق نہیں ہے۔''

''تو پھر آپ یہ بھی تسلیم کرلیں کہ ماجد اپنے بیٹے کی بیماری کا بہانہ کر کے آپ سے پورے مہینے کی تنخواہ لے گیا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ اسے جتنا سیدھا سمجھ رہے ہیں وہ ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ اب سارا معاملہ واضح ہو گیا ہے۔ مشتاق اور خالدہ کی بیٹی پروین عرف پینو ماجد کے ساتھ ہی گھر سے بھاگی ہے۔''

''ملک صاحب......'' منشی جبار سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کو یہ پرچہ کہاں سے ملا ہے؟''

''پینو کے کپڑے رکھنے والے صندوق میں سے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اور وہ صندوق بھی کپڑوں کے وجود سے ایک دم خالی پڑا ہے۔''

''ماجد ایک شادی شدہ شخص ہے اور ایک بیٹے کا باپ بھی ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''وہ پینو کو لے کر اپنے گاؤں تو نہیں گیا ہوگا۔''

''آپ کی بات میں وزن ہے منشی صاحب......'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''بہ شرط یہ کہ ماجد واقعتاً شادی شدہ ہو اور اس کی بیوی و بیٹا چک بیالیس شرقی میں رہتے ہوں۔''

''یہ تو آپ عجیب بات کر رہے ہیں ملک صاحب!'' اس کی آنکھوں میں الجھن نمودار ہوئی۔ ''کیا آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ ماجد نے اپنی بیوی، بچے اور گاؤں کے حوالے سے غلط بیانی کی ہوگی؟''

آپ بھی ماجد کے چک گئے ہیں اس سے ملنے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''نہیں!'' اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''میں بھی نہیں گیا مگر اب جانا لازم ٹھہرا ہے۔'' میں نے پُرعزم لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا آپ نے بھی ماجد کی

بیوی صغریٰ اور اس کے ساڑھے تین سالہ بیٹے طارق کو کہیں دیکھا ہے؟"
"نہیں جناب......" وہ سر کو انکاری حرکت دیتے ہوئے بولا۔ "بس، ذکر ہی سنا ہے۔"
"میں نے بھی ذکر ہی سنا ہے منشی صاحب!" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "مشتاق اور خالدہ نے بھی ماجد کی زبانی ہی یہ قصہ سن رکھا ہے۔ کوئی بھی شخص چک بیالیس شرقی گیا ہے اور نہ ہی ماجد کی بیوی اور بچے سے ملا ہے......" میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔
"اب یہ کام مجھے ہی کرنا ہو گا منشی صاحب!"
"اللہ آپ کو کامیابی عطا فرمائے......!" وہ پُرخلوص انداز میں بولا۔
میں نے صدقِ دل سے کہا۔ "آمین......!"

☆☆☆

آئندہ روز میں نے کانسٹیبل آفتاب احمد کو ساتھ لیا اور چک بیالیس شرقی کی جانب روانہ ہو گیا۔ پینو کی گمشدگی کو دو دن گزر گئے تھے اور آج تیسرا دن شروع ہوا تھا۔ وہ بائیس فروری دن میں دس اور بارہ بجے کے درمیان گھر سے غائب ہوئی تھی اور سعید و نائی کے بیان کے مطابق اس نے لگ بھگ گیارہ بجے پینو کو گرم چادر کی بکل مارے جی ٹی روڈ کے کنارے کھڑے دیکھا تھا۔ پینو کے صندوق سے برآمد ہونے والی مختصر تحریر سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا کہ کسی نے اسے بائیس فروری کی دوپہر گیارہ بجے جی ٹی روڈ پر مولوی کے کھوکھے کے سامنے پہنچنے کو کہا تھا اور وہ "کسی" کوئی اور نہیں بلکہ مشتاق کا کرائے دار ماجد تھا۔
ساری کڑیاں ایک ایک کر کے آپس میں جڑتی چلی جا رہی تھیں اور میں نے چوبیس فروری کی صبح اسی لیے چک بیالیس شرقی کا رخ کیا تھا تاکہ اس کیس کی زنجیر کو مکمل کر سکوں۔ اس وقت میں اور کانسٹیبل آفتاب احمد ایک ویگن پر سوار ہو کر اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھے اور ہم دونوں سول ڈریس میں تھے۔
"ملک صاحب! آج آپ بہت زیادہ خاموش ہیں۔" مجھے سوچوں میں ڈوبا دیکھ کر آفتاب نے کہا۔ "سب خیریت تو ہے نا؟"
"آفتاب......!" میں نے اس کی جانب رخ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ "خدا کو حاضر و ناظر جان کر بتاؤ کہ ہم جس محکمے سے تعلق رکھتے ہیں وہاں "خیریت" نام کی کوئی چیز پائی جاتی ہے؟"
"نہیں جناب......!" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "یہاں تو ہر طرف افراتفری اور بھاگ دوڑ ہی لگی رہتی ہے لیکن میرے پوچھنے کا یہ مقصد نہیں تھا......!"
"جہاں افراتفری اور بھاگ دوڑ کا ماحول بنا ہوا ہو وہاں خیریت کی توقع رکھنا دیوانے کا خواب ہی ہو گا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بہرحال، تم بتاؤ...... تمہارے سوال کرنے کا مقصد کیا تھا؟"
"میں نے آپ کو پہلے کبھی اتنا خاموش نہیں دیکھا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "بس، اسی لیے پوچھ لیا......"
"میرا ذہن پینو اور ماجد میں الجھا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "جب تک میں اس گتھی کو سلجھا نہیں لیتا، مجھے سکون نہیں ملے گا۔"
"آپ کل جنید خان کے ساتھ چمن آباد گئے تھے ہیں نا......؟" آفتاب نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔
"ہاں، گیا تھا۔" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ "وہاں سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی ہی میں تو ہم نے چک بیالیس شرقی جانے کا قصد کیا ہے۔ میں یہ ساری باتیں، تھانے سے نکلنے سے پہلے تمہیں بتا چکا ہوں۔"
"جی ملک صاحب......" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ "میں...... دراصل جنید خان کے بارے میں سوچ رہا تھا......"
"کیوں...... جنید خان کو کیا ہوا ہے؟"
"جب کل شام آپ تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر کی طرف چلے گئے تھے تو جنید آپ کو ڈھونڈ رہا تھا......" وہ متذبذب انداز میں بولا۔ "مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ آپ سے کوئی خاص بات کرنا چاہ رہا ہو۔"
"میں پینو کی طرح کوئی مفقود الخبر تھوڑی تھا جو جنید مجھے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔" میں نے کانسٹیبل آفتاب کو گھورا۔ "اگر اسے مجھ سے کوئی ضروری کام تھا تو سیدھا میرے کوارٹر پر آ جاتا۔"
"میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ آپ سے کیا کہنا چاہ رہا تھا۔" وہ معتدل انداز میں بولا۔ "بس، میں نے جو محسوس کیا، وہ آپ کو بتا دیا ہے۔"
آج صبح جب ہم تھانے سے روانہ ہو رہے تھے تو اس وقت جنید خان تھانے میں موجود نہیں تھا ورنہ وہ مجھ سے مل کر اپنے ذہن کا بوجھ ضرور ہلکا کر لیتا۔
"چلیں، ٹھیک ہے۔" میں نے کانسٹیبل آفتاب سے کہا۔ "چک بیالیس شرقی سے واپسی پر میں جنید خان سے ملاقات کر لوں گا، پھر پتا چل جائے گا کہ گزشتہ رات وہ مجھے

کیوں تلاش کر رہا تھا۔‘‘
میرے اس جواب کے بعد آفتاب چپ ہو کر بیٹھ گیا۔
گزشتہ روز دورۂ چمن آباد میں جنید خان تمام وقت میرے ساتھ تھا ما سوائے جب میں اول، پینو کے غمزدہ والدین سے اور دوم، زیبائش ٹیکسٹائل ملز کے منشی عبدالجبار سے گفت وشنید میں مصروف رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ زیبائش ٹیکسٹائل ملز کا رخ کرنے سے پہلے میں نے جنید خان اور کوچوان علی محمد کو ’’سموسہ + پکوڑا‘‘ دعوت اڑانے کا حکم دیا تھا اور مشاق سائیکلوں والے کے گھر میں قدم رکھنے سے پہلے میں نے جنید خان کو تاکید کی تھی کہ وہ اِدھر اُدھر گھوم پھر کر معلومات اکٹھا کرنے کی کوشش کرے۔
’’تو کیا جنید خان کو گمشدہ پینو کے حوالے سے کوئی اہم بات پتا چلی تھی......‘‘ میرے ذہن میں ایک طاقتور خیال نے جنم لیا۔ ’’اور گزشتہ رات جنید خان یہی بات مجھے بتانے کے لیے بے چین ہو رہا تھا؟‘‘
میں نے اپنے ذہن کو تسلی دی۔ ’’اب جو بھی ہے، واپس تھانے پہنچ کر دیکھ لیں گے۔ فی الحال مجھے چک بیالیس شرقی پر فوکس کرنا چاہیے۔‘‘
ویگن نے ہمیں سڑک کے کنارے ایک ایسے مقام پر اتارا جہاں سے چک بیالیس شرقی لگ بھگ آدھے میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ ہم نے یہ مسافت پیدل چلتے ہوئے طے کی اور بخیر وعافیت اپنی منزل پر پہنچ گئے۔
ماجد کا گھر تلاش کرنے میں ہمیں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس وقت ہم عوامی لباس میں تھے اس لیے چک بیالیس شرقی میں کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوئی ورنہ اگر ہم پولیس کی وردی میں ہوتے تو پورے گاؤں میں تھرتھلی مچ جاتی۔
ماجد کے باپ منظور کی چک بیالیس میں کریانے کی دکان تھی اس لیے بھی ..... اس کے گھر تک رسائی حاصل کرنے میں ہمیں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی، پوچھ تاچھ پر ہمیں پتا چلا کہ اس وقت گھر پر ماجد کی ماں شاہدہ اور اس کی بیوی صغریٰ عرف سگی موجود تھیں جبکہ منظور اپنی دکان میں بیٹھا ہوا تھا۔ ہم سیدھا اس کی دکان پر پہنچے تھے جو کہ گھر کے سامنے والے حصے میں تھی۔
’’میرا نام صفدر علی ہے اور یہ میرا دوست آفتاب حسین ہے۔‘‘ میں نے معمولی سے ردوبدل کے ساتھ تعارف کراتے ہوئے منظور کو بتایا۔ ’’ہم حافظ آباد میں رہتے ہیں اور تمہارے بیٹے ماجد سے ملنے آئے ہیں۔‘‘

منظور کی عمر پچپن کے اریب قریب رہی ہوگی۔ وہ گندمی رنگت اور عام سی شکل وصورت کا مالک ایک سادہ طبیعت انسان تھا۔ اس کے سر کا درمیانی حصہ بالوں سے فارغ تھا۔ کھوپڑی کے گرداگرد چھدرے بالوں کی جھالر نظر آ رہی تھی۔
منظور نے الجھن زدہ انداز میں باری باری ہم دونوں کے چہروں کا جائزہ لیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ’’میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ آپ ماجد سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں؟‘‘
’’بزرگو...... آپ نے ہمیں اس لیے نہیں پہچانا کہ آج سے پہلے کبھی ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔‘‘ میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ’’اور جب ماجد سامنے آئے گا تو سلسلہ بھی بتا دیں گے۔‘‘
میرے انداز میں اچھی خاصی چبھن پائی جاتی تھی۔ منظور نے تشویش بھرے انداز میں استفسار کیا۔ ’’سب خیریت تو ہے نا......؟‘‘
’’چاچا منظور......‘‘ آفتاب نے ماجد کے باپ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’ابھی تک تو خیریت نہیں ہے۔ ماجد ہتھے چڑھ گیا تو پھر امید کی جاسکتی ہے کہ خیریت ہو جائے گی......‘‘ لمحاتی توقف کر کے اس نے بوجھل سانس خارج کی پھر کڑے لہجے میں پوچھا۔
’’ماجد ہے کہاں...... کیا وہ گھر کے اندر چھپ کر بیٹھا ہوا ہے؟ اسے باہر نکالو ورنہ ہمیں زبردستی تمہارے گھر میں گھسنا پڑے گا......‘‘
آفتاب کے جارحانہ انداز نے منظور کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ اس نے فکرمندی سے پوچھا۔ ’’ماجد نے ایسا کیا کر دیا ہے؟‘‘
’’وہ چمن آباد سے ایک کڑی اغوا کر کے یہاں لایا ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’اور ہم پینو نامی اسی کڑی کو برآمد کرنے اور تمہارے بیٹے کو گرفتار کرنے یہاں آئے ہیں۔ اب بات آئی سمجھ میں......؟‘‘
’’تت...... تو آپ لوگوں...... کا تعلق...... پولیس سے ہے......؟‘‘ وہ پریشانی بھرے لہجے میں مستفسر ہوا۔
’’ٹھیک سمجھے ا‘‘ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ’’میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔ میں تھانہ انچارج ہوں اور یہ کانسٹیبل آفتاب احمد ہے۔ چمن آباد میرے تھانے کی حدود میں آتا ہے اسی لیے ہم ماجد کی تلاش میں اِدھر آئے ہیں۔‘‘

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا......'' وہ بے چارگی سے بولا۔ ''یہ چمن آباد ہے کہاں اور میرے بیٹے کا کسی پینو سے کیا واسطہ......؟''

''چمن آباد، ضلع گوجرانوالہ، تحصیل گوجرانوالہ کا ایک نواحی گاؤں ہے جو جی ٹی روڈ کے کنارے، زیبائش ٹیکسٹائل ملز کے عقب میں واقع ہے۔ پینو اسی گاؤں میں رہتی تھی اور ماجد پینو کے گھر میں ایک کرائے دار کی حیثیت سے قیام پذیر تھا۔ بائیس فروری کی دوپہر ماجد اور پینو، چمن آباد سے غائب ہوگئے تھے یعنی صرف دو دن پہلے......'' میں سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں اضافہ کیا۔ ''کیا اتنی تفصیل کافی ہے یا......؟''

میں نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو منظور کریانہ فروش اضطراری انداز میں بولا۔ ''یقیناً آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے جی!''

''غلط فہمی......!'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''وہ جی، بات دراصل یہ ہے کہ......'' منظور وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میرا بیٹا ماجد بھی چمن آباد نہیں گیا اور اسے کسی کے گھر میں کرائے پر رہنے کی بھی ضرورت نہیں۔ وہ تو جب سے پیدا ہوا ہے، ادھر اسی گھر میں رہ رہا ہے اس پرچون کی دکان میں وہ میرا ہاتھ بٹاتا ہے۔ وہ اس وقت دکان کے لیے سودا وغیرہ لینے نزدیکی شہر گیا ہوا ہے۔ بس، اب وہ واپس آنے ہی والا ہے......اور آپ پتا نہیں، میرے بیٹے پر کیسے کیسے الزام لگا رہے ہیں۔''

منظور کی اس سنسنی خیز وضاحت نے تو میرا دماغ گھما کر رکھ دیا تھا۔ میں اپنے ذہن میں جو کہانی لے کر چک بیالیس شرقی پہنچا تھا، وہ یکلخت کلٹی ہوگئی تھی لیکن میں اتنی جلدی ہار ماننے والا نہیں تھا لہٰذا میں نے منظور پر تیز و تند سوالات کی بوچھاڑ کردی۔

''منظور! کیا تم اس بات سے انکاری ہو کہ ماجد کی عمر لگ بھگ ستائیس سال ہے؟''

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے اس لیے میں انکار نہیں کروں گا۔''

''ماجد کی بیوی کا نام صغریٰ ہے لیکن سب اسے ''سگی'' کہہ کر پکارتے ہیں۔'' میں نے استفسارات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''سگی اس وقت کم و بیش پچیس سال کی ہے۔''

''جی...... یہ سب بھی ٹھیک ہے۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''ماجد تمہاری اکلوتی اولاد ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور تم نے پانچ سال پہلے اس کی سگی سے شادی کی تھی۔ ان دونوں کا ایک بیٹا ہے جس کا نام طارق ہے۔ اس وقت طارق کی عمر ساڑھے تین سال ہے؟''

منظور نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کو ہمارے بارے میں یہ ساری باتیں کیسے پتا چلی ہیں تھانے دار صاحب......؟''

اس دوران میں چک بیالیس شرقی کے چند وسنیک بھی وہاں جمع ہوگئے تھے اور بڑی دلچسپی سے ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہے تھے۔

''تمہارے ہر سوال کا جواب میں بعد میں دوں گا چاچا منظور......!'' میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ''پہلے تم میرے انٹرویو میں پاس ہوکر دکھاؤ۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے تم سے جو پوچھا، وہ غلط ہے یا صحیح؟''

''سو فیصد صحیح ہے جناب!'' وہ تصدیق کرتے ہوئے بولا۔

''تو پھر تم اس بارے میں کیا کہتے ہو......'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''تمہارا بیٹا ماجد تانا ماسٹر ہے۔ وہ ایک سال پہلے روزگار کے سلسلے میں چمن آباد کی طرف نکل گیا تھا۔ اس نے زیبائش ٹیکسٹائل ملز میں ملازمت اختیار کی اور چمن آباد میں مشتاق سائیکلوں والے کے گھر کا ایک کمرا کرائے پر حاصل کرکے وہاں رہنے لگا۔ فیکٹری سے ماجد کو پچاس روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ وہ ہر ماہ کی سات تاریخ کے بعد آنے والے ہفتہ اور اتوار کو یہاں چک بیالیس شرقی آپ لوگوں سے ملنے آیا کرتا ہے اور پیر یعنی سوموار کی صبح وہ واپس اپنی نوکری پر روانہ ہوجاتا ہے......؟''

''ان میں سے کوئی ایک بات بھی درست نہیں ہے تھانے دار صاحب!'' وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں تو ان لوگوں سے پوچھ لیں......'' اس نے اپنی دکان کے سامنے جمع ہونے والے نصف درجن سے زیادہ افراد کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب ماجد کو بچپن سے جانتے ہیں جناب......!''

ہجوم کے ری ایکشن نے میری حیرت کو الجھن میں ڈال دیا۔ وہ سب منظور کے موقف کی تائید کر رہے تھے یعنی منظور کے اکلوتے بیٹے ماجد نے کبھی چمن آباد کا رخ کیا تھا اور نہ ہی زیبائش ٹیکسٹائل ملز میں کبھی ملازمت کی تھی۔ ان حالات کے پیشِ نظر ماجد کے پینو کو بھگا لے جانے کا کوئی

جواز نہیں بنتا تھا پھر...... وہ کون شخص تھا جس کی تلاش میں ہم چک بیالیس شرقی پہنچے تھے؟

اُدھر یہ خطرناک سوال میرے ذہن میں ابھرا، ادھر بے ساختہ میری زبان سے نکلا۔ ''تو پھر مشتاق سائیکلوں والے کی بیٹی پینو کو کون بھگا کر لے گیا ہے؟ وہ جو کوئی بھی تھا، اس نے چمن آباد اور زیبائش ملز میں ملازمت اختیار کرتے ہوئے اپنا نام ماجد کیوں بتایا؟ اس نے مشتاق اور اس کی بیوی و بیٹی سے یہ کیوں کہا کہ وہ چک بیالیس شرقی کا رہنے والا ہے۔ اس کی بیوی کا نام صغریٰ عرف سگی اور بیٹے کا نام طارق ہے جو ساڑھے تین سال کا ایک گول مٹول اور پیارا سا بچہ ہے؟ اس پراسرار بندے نے پینو کو گھر سے بھگا لے جانے کے لیے تمہارے بیٹے ماجد کی شخصیت اور پس منظر کا سہارا کیوں لیا؟''

''تھانے دار پتر......'' ایک ضعیف العمر شخص نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر میری یادداشت ساتھ دے رہی ہے تو میں آپ کو اس بندے تک پہنچا سکتا ہوں جس نے آپ سب کو دھوکا دیا ہے۔''

''وہ کس طرح بابا جی؟'' میں نے چونک کر اس خمیدہ کمر بڑھے بابے کی طرف دیکھا۔ ''آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر اس دغاباز کو پکڑنے میں آپ میری کچھ مدد کردیں......''

''میں ابھی بعد میں کہوں گا کیونکہ ابھی میں کافی کچھ سوچ رہا ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''پہلے آپ مجھے یہ بتائیں کہ پینو کو گھر سے بھگا لے جانے والے بندے کا حلیہ اور قد کاٹھ کیسا ہے......؟''

میں نے سوالیہ نظر سے آفتاب احمد کی جانب دیکھا اور کہا۔ ''آفتاب! تم بابا جی کو ماجد کی شکل صورت اور وضع قطع کے بارے میں بتاؤ۔''

سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے صرف ماجد کا نام ہی سنا تھا اور وہ بھی محض دو روز پہلے۔ میری اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ آفتاب کو اپنے ساتھ چک بیالیس شرقی لانے کا میرا ایک خاص مقصد تھا اور وہ یہ کہ آفتاب، ماجد کا صورت آشنا تھا۔ دراصل آفتاب ہوٹل بازی کا عادی تھا۔ اس نے ماجد کو تین چار بار مولوی کے کھوکھے پر کھانا کھاتے دیکھا تھا۔ میں چونکہ ماجد کی تلاش میں چک بیالیس شرقی آیا تھا لہٰذا مجھے کسی ایسے ہم سفر کی ضرورت تھی جو ماجد کو دیکھتے ہی پہچان لے چنانچہ اس سفر میں آفتاب کو میں نے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔

میرے حکم پر کانسٹیبل نے ماجد کا حلیہ اور جسامت تفصیل سے بیان کردی۔ جب کانسٹیبل خاموش ہوا تو وہ بابا سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''مجھے تو یہ رمضان علی کا پتر قدیر لگتا ہے......!''

ایک دو اور پختہ عمر افراد نے بھی اس بڈھے بابے کی بات کی تصدیق کردی۔ یہ سب سن کر میرے رگ وپے میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ میں نے ان سب کو بحیثیت مجموعی مخاطب کرکے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''کون رمضان اور کون قدیر......؟''

''قدیر...... رمضان اور صفیہ کا اکلوتا بیٹا تھا۔'' ایک ادھیڑ عمر شخص نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں مجھے بتایا۔ ''وہ لوگ بھی ادھر ہی چک بیالیس شرقی میں رہتے تھے اور کھیتی باڑی سے گزر بسر کرتے تھے۔ کافی عرصہ پہلے رمضان کی موت ہوگئی...... کھیتوں میں کام کرتے ہوئے ایک زہریلے سانپ نے رمضان کو ڈس لیا تھا۔ صفیہ دماغی طور پر کمزور تھی بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ صفیہ دماغی مریضہ تھی اور یہ اثرات قدیر کے اندر بھی منتقل ہوئے تھے۔ اس کی باتیں صحیح الدماغ افراد سے بہت مختلف تھیں۔ وہ اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ گاؤں والے جاہل ہیں جو اس کی باتیں ان لوگوں کے پلے نہیں پڑتی ہیں۔ قدیر کے ایسے ہی رویے کی وجہ سے اکثر لوگوں نے اسے ''پروفیسر'' کہہ کر چھیڑنا بھی شروع کردیا تھا......'' وہ سانس درست کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''لگ بھگ تین سال پہلے قدیر یہ گاؤں چھوڑ کر اچانک کہیں غائب ہوگیا تھا پھر اس نے پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا۔ کوئی نہیں جانتا کہ قدیر اس وقت کہاں ہوگا اور کیا کررہا ہوگا مگر آپ کے سپاہی نے ماجد کا جو حلیہ بیان کیا ہے وہ تو ہوبہو قدیر ہی لگتا ہے۔''

''اور قدیر کی ماں صفیہ......!'' میں نے اس کے خاموش ہونے پر بے چینی سے کہا۔ ''میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''صفیہ کے انتقال کے بعد ہی تو قدیر غائب ہوا تھا۔'' مجھے بتایا گیا۔ ''ماں جیسی تیسی بھی تھی جب تک وہ زندہ تھی، قدیر نے گاؤں چھوڑنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا لیکن صفیہ کی وفات کے بعد وہ بہت زیادہ اداس ہوگیا تھا اور پھر ایک دن اچانک وہ غائب ہوگیا۔''

''قدیر نے تعلیم کہاں تک حاصل کی تھی؟'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت سوال کیا۔

مجھے بتایا گیا۔ ''وہ چار جماعتیں پاس تھا مگر خود کو کسی

عالم فاضل سے کم نہیں سمجھتا تھا۔"

"اور ماجد......!" میں نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔"یہ کتنی جماعتیں پڑھا ہوا ہے؟"

میں نے ان لوگوں کو گمشدہ پینو کے صندوق سے ملنے والے یک سطری پیغام اور منشی عبدالجبار کی فائل میں سنبھال کر رکھی ہوئی تنخواہ میں اضافے کی درخواست کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

"ایک جماعت بھی نہیں۔" ماجد کے باپ منظور نے جواب دیا۔"میرا پتر چٹا ان پڑھ ہے مگر حساب کتاب میں خاصا تیز ہے۔ میری دکان کا سارا نظام وہی چلاتا ہے اور بازار سے سودا سامان لانا بھی اسی کے ذمے ہے۔"

میں اس وقت جس نوعیت کی صورتِ حال سے دوچار تھا اس کے مطابق منظور کریانہ فروش کا اکلوتا بیٹا ماجد وہ شخص ہرگز نہیں ہوسکتا تھا جس کی تلاش میں، میں اپنے تھانے سے چک بیالیس شرقی پہنچا تھا۔ باقی قدیر نامی یہ بندہ پینو کی گمشدگی میں بہ حیثیت ماجد ملوث تھا یا نہیں، اس بارے میں سردست میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ کیس کل شام تک جتنا سہل اور سیدھا دکھائی دے رہا تھا، وہ سہانا خواب چکنا چور ہوکر رہ گیا تھا اور ایک مرتبہ میں پھر اندھیری گلی میں کھڑا تھا۔

میں اپنے مطلوبہ بندے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس مجمع میں سے کسی نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بہ آوازِ بلند کہا۔

"لوجی...... ماجد بھی آگیا!"

میں نے اس طرف دیکھا جدھر اس بندے نے اشارہ کیا تھا۔ مجھے مذکورہ سمت میں ایک سائیکل سوار سامان والے تھیلوں سے لدا پھندا نظر آیا۔ میں نے اس شخص پر نگاہ جمادی۔

جلد ہی وہ ہمارے نزدیک پہنچ گیا۔ اس نے اپنی سائیکل کو کریانے کی دکان کے پہلو میں کھڑا کیا پھر وہاں موجود افراد کو حیرت اور استعجاب بھری نظر سے دیکھنے کے بعد منظور سے مستفسر ہوا۔

"ابا! کیا ہوگیا...... سب خیریت تو ہے نا؟"

منظور نے میرا اور آفتاب کا تعارف کرانے کے بعد ماجد کو بتایا۔"پترا! کسی بندے نے تمہارے نام پر ادھر چمن آباد میں بڑی افراتفری مچادی ہے اور ایک کڑی کو بھی بھگا لے گیا ہے۔ پولیس اسی کی تلاش میں ہمارے پنڈ آئی ہے۔"

میں نے پُرمعنی سوالیہ نظر سے آفتاب احمد کی طرف دیکھا۔ وہ ایک منٹ تک بغور ماجد کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔"ملک صاحب! یہ ہمارا

مطلوبہ! حد نہیں ہے۔''
''لیکن یہ کیسے ممکن ہے......'' ماجد نے اپنے باپ کی وضاحت کے جواب میں قدرے تیز آواز میں کہا۔ ''کوئی شخص میرا نام اختیار کر کے اتنا بڑا دھوکا کس طرح کر سکتا ہے؟''

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں منظور کریانہ فروش کے بیٹے ماجد کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ تب جا کر بات اس کی سمجھ میں آئی۔ اس کے بعد بھی وہ کافی دیر تک مجھے بے یقینی سے دیکھتا رہا۔

چک بیالیس شرقی میں اب ہمارا کوئی کام باقی نہیں رہا تھا۔ مجھے جس بندے کی تلاش تھی وہ منظور کا بیٹا ماجد ہرگز نہیں تھا لہٰذا ہم نے واپسی کی راہ لی۔

☆☆☆

پچیس فروری کی صبح میری آنکھ کافی دیر سے کھلی اور اس کا سبب چوبیس فروری کی رات تاخیر سے سونا تھا اور اس کے نتیجے میں میری فجر کی نماز بھی نکل گئی تھی۔

جب میں اور کانسٹیبل آفتاب احمد چک بیالیس شرقی سے روانہ ہوئے تو میرا اندازہ یہی تھا کہ مغرب سے پہلے ہم اپنے تھانے پہنچ جائیں گے مگر اس روز ہر قدم الٹا ہی پڑ رہا تھا۔ ایک تو مجھے جس ماجد کی تلاش تھی وہ چک بیالیس شرقی میں کہیں موجود نہیں تھا اور جس ماجد سے میں ٹکرا رہا تھا، وہ میرے کسی کام کا نہیں تھا۔ اس وقتی ناکامی نے مجھے کوفت میں مبتلا کر دیا تھا پھر اس وقت اس کوفت میں شدید نوعیت کی جھنجلاہٹ بھی شامل ہو گئی جب چک بیالیس شرقی سے روانہ ہونے کے پانچ منٹ بعد ہی ہماری ویگن خراب ہو گئی اور خراب بھی ایسی کہ ٹھیک ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اس کے انجن میں کوئی ایسا فالٹ آ گیا تھا جو باوجود کوشش کے بھی ڈرائیور کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ طرفہ تماشا یہ کہ وہ اس روٹ کی آخری ویگن تھی۔ اگلی ویگن کل صبح ہی وہاں سے گزرنے والی تھی۔

ہم ایک طرح سے ''نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن'' ایسی صورتِ حال سے دوچار ہو کر رہ گئے تھے۔ اس مقام سے پیدل چل کر تھانے پہنچنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ایک تو موسم ٹھنڈا ٹھار، اوپر سے مری کی برفیلی ہوا بھی چل پڑی تھی اور ان نامساعد حالات میں قرب و جوار میں کوئی محفوظ پناہ گاہ بھی نظر نہیں آ رہی تھی چنانچہ ''مجبوری کا نام شکریہ'' کے مصداق ویگن کے اندر دبک کر بیٹھے رہنا ہی دانش مندانہ فیصلہ تھا اور درحقیقت یہ حالات اور وقت کا تقاضا بھی تھا۔ انسان اپنے حالات کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔

خدا خدا کر کے رات گیارہ بجے ویگن کا ڈرائیور انجن کے فالٹ کو پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے پندرہ منٹ بعد ہماری ویگن سڑک پر رواں دواں تھی۔ اب آپ خود اندازہ لگا لیں کہ میں کب تھانے پہنچا ہوں گا اور عشا کی نماز کی ادائیگی کے بعد کب مجھے سونا نصیب ہوا ہوگا۔

اگلی صبح میں تھانے پہنچا اور کانسٹیبل جنید خان کو اپنے پاس طلب کر لیا۔ وہ بھی مجھ سے ملاقات کے لیے بے قرار تھا لہٰذا دوڑتا چلا آیا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور کچھ کہنے کے لیے اپنے لب وا کرنے ہی والا تھا کہ میں نے سوال داغ دیا۔

''کیا میں نے تھانے کے عملے میں سے کسی کو اپنے کوارٹر کی طرف آنے سے منع کیا ہے؟''

''نہیں جی......'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بلکہ آپ کا تو فرمان ہے کہ اگر کام ہو تو ہم آپ کو رات کے آخری پہر بھی ڈسٹرب کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ نے ہمیں فری ہینڈ دے رکھا ہے۔''

''تو پھر تمہارے فری ہینڈ کو کسی نے ہتھکڑی لگا دی تھی یا میرا فرمان تمہارے ذہن سے مٹ گیا تھا؟'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''مجھے پتا چلا ہے، پچھلی رات تم مجھ سے ملنا چاہتے تھے؟''

''جی ملک صاحب......'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''بتاؤ، کیا معاملہ تھا؟''

''پہلے آپ وعدہ کریں کہ مجھ سے ناراض نہیں ہوں گے۔'' وہ بڑی سادگی سے بولا۔ ''پھر میں آپ کو اصل بات بتاتا ہوں......''

''میں کوئی تمہاری محبوبہ ہوں جو ذرا سی بات پر تم سے روٹھ جاؤں گا......'' میں نے معنی خیز نظر سے اسے گھورا۔ ''یا پھر تم کسی سنگین جرم کے مرتکب ہوئے ہو؟ تم نے کسی مجرم سے رشوت لے کر اسے چھوڑ دیا ہے یا پھر......؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ملک صاحب......!'' وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی منت ریز لہجے میں بولا۔

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور سوال کیا۔ ''تو پھر کیسی بات ہے؟''

''آپ نے کل مشتاق سائیکلوں والے کے گھر کے سامنے میری ڈیوٹی لگائی تھی کہ میں گھوم پھر کر پینو کی گمشدگی کے حوالے سے معلومات اکٹھا کروں۔''

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''بس، اسی سلسلے میں مجھ سے ایک چھوٹی سی کوتاہی ہو گئی......!''

''کیسی کوتاہی......'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے

پوچھا۔ ''کیا تم نے اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں جو تمہیں کچھ بھی دکھائی نہیں دیا یا تم نے اپنی سماعت پر تالا ڈال لیا تھا جس کی وجہ سے تمہیں کچھ سنائی نہیں دیا؟''

''مجھے دکھائی بھی دیا اور سنائی بھی۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''بس، میں آپ سے اس کا ذکر نہ کر سکا۔ یہی سوچا تھا کہ آپ جب زیبائش ٹیکسٹائل ملز سے واپس آئیں گے تو آپ کو سب کچھ بتا دوں گا لیکن پھر یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی اور جب دوبارہ یاد آیا تو آپ تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر میں جا چکے تھے......!''

''سچ سچ بتاؤ، تم نے کل تانگے میں بیٹھ کر کتنے سموسے اور پکوڑے پیلے تھے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے استفسار کیا۔ ''کیونکہ جب میں واپس آیا تو دونوں تھیلے خاصے ہلکے ہو چکے تھے؟''

''بس جی...... میں نے تھوڑے سے پکوڑے اور کوئی چھ سات سموسے ہی کھائے تھے......'' وہ بڑی معصومیت سے بولا۔

''یہ ''بس جی'' نہیں بلکہ ''ٹرک جی'' ہے......!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تلی ہوئی چیزیں زیادہ مقدار میں کھانے سے معدے پر بوجھ پڑتا ہے اور اس بوجھ کو ہٹانے کے لیے انسان کی عقل کھوپڑی میں سے نکل کر انسان کے معدے میں پہنچ جاتی ہے۔ جس کے بعد انسان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت خاصی ماند پڑ جاتی ہے اور یادداشت تو سمجھو...... لمبی تان کر سو جاتی ہے......!''

''غلطی ہو گئی ملک صاحب!'' وہ عاجزانہ انداز میں بولا۔ ''آئندہ میں کھانے کے معاملے میں احتیاط برتوں گا۔''

''اگر تم ایسا کرو گے تو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''کم سونا عبادت، کم بولنا حکمت اور کم کھانا صحت ہے...... یہ مولائے کائنات کا فرمان ہے اور مولا کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ دُرِ نایاب کی حیثیت کا حامل ہے۔ یاد رکھو...... کم کھانا انسان کھاتا ہے اور زیادہ کھانا انسان کو کھا جاتا ہے۔''

''سمجھ گیا جی۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''میں نے آپ کی نصیحت کو پلے باندھ لیا ہے ملک صاحب!''

''شاباش...... تو پھر شروع ہو جاؤ۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''مجھے بتاؤ تم کل رات مجھ سے ملاقات کے لیے کیوں مضطرب تھے؟''

''مجھے پینو کے بارے میں ایک خاص بات پتا چلی تھی۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''کل جب آپ مشتاق سائیکلوں والے کے گھر میں مصروف تھے تو میری فرید پراچہ سے ملاقات ہو گئی۔ فرید میرا پرانا دوست ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ بائیس فروری کی دوپہر وہ مولوی کے کھوکھے پر بیٹھا چائے پی رہا تھا تو لگ بھگ گیارہ بجے اس نے پینو کو جی ٹی روڈ کے کنارے کھڑے دیکھا تھا......''

''کچھ نیا بتاؤ......'' میں نے اس کی بات کاٹ دی اور کہا۔ ''یہ سب میں پہلے سے جانتا ہوں۔''

''آپ مجھے بات تو پوری کرنے دیں نا ملک صاحب......'' وہ دبے دبے جوش کے ساتھ بولا۔ ''میں آپ کو کچھ نیا ہی بتانے والا تھا۔''

''ٹھیک ہے، بتاؤ......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اس پر نگاہ جما دی اور کہا۔ ''میں پوری توجہ سے تمہاری بات سن رہا ہوں۔''

''تھوڑی ہی دیر کے بعد فرید پراچہ نے ماجد کو ''جنرل سرائکس'' کے پہلو سے نکلتے دیکھا۔'' جنید خان مجھے اپنی کارکردگی کی تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔ ''ماجد دائیں بائیں دیکھتے ہوئے بڑے محتاط قدموں سے چلتے ہوئے پینو کے نزدیک پہنچ گیا۔ پینو نے اس وقت گرم چادر میں اپنے وجود کو اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ اسی چادر کے اندر سے پینو نے ایک چھوٹی سی گٹھری نکال کر ماجد کو تھمائی۔ ان کے درمیان مختصری گفتگو بھی ہوئی تھی جو ظاہر ہے فرید سن نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ ان دونوں سے خاصے فاصلے پر مولوی کے کھوکھے کے اندر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ بس اس نے اتنا ہی دیکھا کہ ماجد اور پینو جی ٹی روڈ کے کنارے جنوب کی سمت پیدل ہی چل پڑے تھے......''

مولوی کے کھوکھے سے جنوب کی جانب پہلا گاؤں کنگنی والا تھا اور اگر وہ لوگ کسی بس یا ویگن پر سوار ہو جاتے تو کہیں کے کہیں بھی پہنچ سکتے تھے۔ کیا انہوں نے گھر سے بھاگ کر کنگنی والا میں پناہ لینے کا فیصلہ کیا تھا؟ میرے ذہن میں اچانک یہ سوال ابھرا لیکن اگلے ہی لمحے میرے ذہن نے اس سوال کی نفی کر دی کیونکہ چمن آباد اور کنگنی والا میں بہ مشکل دو فرلانگ (چار سو چالیس گز یا چوتھائی میل) کا فاصلہ حائل تھا اور اس نام نہاد ماجد نے پینو کو گھر سے بھگا لے جانے میں جتنی مضبوط منصوبہ بندی کی تھی اس کے تناظر میں، میں اس سے ایسی حماقت کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔

کانسٹیبل جنید خان نے فرید پراچہ کے مشاہدے کے حوالے سے مجھے جو کچھ بتایا، اس میں میرے لیے کچھ بھی نیا نہیں تھا لہٰذا میں نے اس کی معلومات میں اضافے کی غرض

سے کہا۔

''ہم سب جس بندے کو ماجد سمجھ رہے ہیں وہ کوئی اور ہے!''

''کیا مطلب ملک صاحب......'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''میری اب تک کی تفتیش اور تحقیق کے مطابق اس چالباز شخص کا نام قدیر ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''قدیر کا تعلق بھی کبھی چک بیالیس شرقی سے رہا ہے اور وہ ماجد کے بارے میں مکمل معلومات رکھتا ہے اسی لیے اس نے بہ آسانی ماجد کا روپ دھار کر چمن آباد اور زیبائش ملز میں، سب کی آنکھوں میں ڈھول جھونکی اور بالآخر پینو کو بھگا لے گیا۔ میں گزشتہ روز چک بیالیس شرقی میں اصلی ماجد سے مل کر آیا ہوں اور وہیں سے مجھے پتا چلا ہے کہ ہمیں جس بندے کی تلاش ہے، وہ قدیر کے سوا اور کوئی ہو نہیں سکتا۔''

''ملک صاحب......!'' میرے خاموش ہونے پر وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ایسا تو صرف فلموں میں ہوتا دیکھا گیا ہے......!''

''فلموں کے اسکرپٹ رائٹرز بھی اسی معاشرے کا حصہ ہیں جنید خان!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ قلم کار جو کہانی رقم کرتا ہے، ویسا معاشرے میں کہیں نہ کہیں پیش آچکا ہوتا ہے اور کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ مصنف کی تحریر کے مطابق مستقبل قریب میں ویسا واقعہ رونما ہو جاتا ہے۔''

جنید خان عقیدت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

ہمارے درمیان گفتگو کا یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ چل سکا۔ اچانک کانسٹیبل شوکت علی میرے کمرے میں داخل ہوا اور اس نے سنسنی خیز لہجے میں بتایا۔

''ملک صاحب! کسی نے ماجد کو قتل کر دیا ہے۔ ادھر کھیتوں میں اس کی لاش پڑی ہے......!''

☆☆☆

کانسٹیبل شوکت کی فراہم کردہ اطلاع نے میرے رگ و پے میں ایک سنسنی سی دوڑا دی تھی اور میں آناً فاناً جنید خان کے ساتھ ایک تانگے پر سوار ہو کر جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔

مرد مذکور کی بے حس و حرکت باڈی کھیتوں کے بیچوں بیچ پڑی تھی اور اس کے اردگرد درجن بھر افراد جمع تھے جو آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ ان سب کی نظر میں وہ اس تانا ماسٹر ماجد کی لاش تھی۔ جو سائیکلوں والے مشتاق کے گھر میں ایک کرائے دار کی حیثیت سے رہائش پذیر تھا اور زیبائش ٹیکسٹائل ملز میں کام کرتا تھا۔ چک بیالیس شرقی کے وسنیک اجتماعی طور پر یہ فتویٰ دے چکے تھے کہ وہ رمضان علی اور صفیہ کا اکلوتا بیٹا قدیر تھا۔ حقیقت کیا تھی، اس سے پردہ اٹھنے کا وقت آن پہنچا تھا۔

میں نے اکڑوں بیٹھ کر اس بے سدھ پڑے شخص کے جسم کا تنقیدی جائزہ لیا۔ اس کی گردن پر مجھے ایسے آثار دکھائی دیے جیسے گلا گھونٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی گئی ہو۔ میں نے معائنے کے سلسلے کو آگے بڑھایا اور اسی معائنے کے دوران میں جب میں نے اس کی بند آنکھوں کو کھول کر اندر نگاہ ڈالی تو میں چونک اٹھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں کہیں بھی موت کی سفاکی اور سرد مہری دکھائی نہیں دی۔ اس کے بجائے وہاں مجھے زندگی کی موہوم سی رمق نظر آئی۔ میں نے اس کے سینے پر کان لگا کر اس کے دل کی دھڑکن کو محسوس کرنے کی کوشش کی تو وہاں بھی موت کے سناٹے سے میرا سابقہ نہیں پڑا۔ فوراً سے پیشتر میرے وجدان نے راہنمائی کرتے ہوئے مجھے بتایا...... یہ شخص ابھی زندگی کی قید سے آزاد نہیں ہوا......!

یہ انتہائی سنسنی خیز احساس تھا اور ایسے مواقع پر میری چھٹی حس نے کبھی مجھے دھوکا نہیں دیا تھا۔ میں کانسٹیبل کو اپنے ساتھ ایک طرف اتنے فاصلے پر لے گیا کہ وہاں پر موجود افراد ہماری باتیں نہ سن سکیں پھر میں نے انتہائی سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''جنید! یہ سب لوگ اس بندے کو مُردہ سمجھ رہے ہیں۔ ایسی کوئی حرکت نہیں کرنا کہ ان میں سے کسی کو ایک لمحے کے لیے بھی شبہ ہو کہ یہ زندہ ہے ورنہ ہم اس موذی تک رسائی حاصل کرنے میں کامیابی نہیں پا سکیں گے جس نے اسے اس حال کو پہنچایا ہے۔''

''تت...... تو آپ...... یہ کہنا چاہ...... رہے ہیں کہ ماجد...... میرا مطلب ہے، قدیر...... زندہ ہے......'' جنید خان نے حیرت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''میرا پیشہ ورانہ تجربہ تو اسی جانب اشارہ کر رہا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میرے مشاہدے نے کبھی مجھے مایوس نہیں کیا۔''

''پھر تو ہمیں فوری طور پر اس بندے کو اسپتال پہنچانا چاہیے تاکہ اسے فوری طبی امداد دی جا سکے۔'' جنید خان نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''جب یہ ہوش میں آنے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرائے گا تو پینو کی پراسرار گمشدگی کا پردہ خود بخود چاک ہو جائے گا۔''

''ہم یہی کرنے والے ہیں مگر ان لوگوں کے سامنے یہ ظاہر کرنا ہے کہ ہم اس بندے کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوا رہے ہیں۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''تم ڈاکٹرز کو صورتِ حال سے آگاہ کر دینا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں بھی اسپتال پہنچ رہا ہوں۔''

''سمجھ گیا ملک صاحب!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''تو آؤ، ہم کام سے لگ جاتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

ہم دوبارہ اس بے ہوش شخص کے پاس آئے اور میں نے بہ آوازِ بلند کہا۔ ''سب سے پہلے ماجد کی لاش کو کس نے دیکھا تھا؟''

ایک ادھیڑ عمر دیہاتی مجمعے میں سے نکل کر میرے سامنے آ گیا اور بولا۔ ''تھانے دار صاحب! میرا نام رفیق ہے۔ میں ادھر سے گزر رہا تھا تو میں نے تانا ماسٹر کو یہاں پڑے دیکھا۔ پھر میں نے آوازیں دے دے کر، لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا۔ کھیتوں میں موجود، اپنے اپنے کام میں مصروف لوگ میری پکار پر فوراً چلے آئے۔ ہمیں یہ پتا چل چکا تھا کہ ماجد، مشتاق کی کڑی پینو کو بھگا لے گیا ہے اور پولیس ان دونوں کو بڑی شدومد سے تلاش کر رہی ہے اسی لیے ہم نے ایک بندے کو فوراً تھانے کی طرف دوڑایا اور اب آپ یہاں موجود ہیں۔''

''جنید خان!'' میں نے کانسٹیبل کو مخاطب کرتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''تم ماجد کی لاش کو تانگے میں ڈال کر فوراً اسپتال کی جانب روانہ ہو جاؤ۔ اس کا پوسٹ مارٹم بے حد ضروری ہے۔''

''جی ملک صاحب!'' وہ فرماں برداری سے بولا۔ ''میں ابھی جا رہا ہوں۔ واپسی پر مجھے یہاں آنا ہے یا تھانے؟''

''تھانے!'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''میں بھی موقع کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد تھانے پہنچ رہا ہوں۔ باقی باتیں ادھر ہی ہوں گی۔''

''اوکے سر!'' اس نے مطمئن انداز میں کہا۔

میں نے دو افراد کو جنید خان کی مدد کرنے کے لیے کہا اور خود خانہ پُری کے لیے وہاں موجود لوگوں سے پوچھ تاچھ کا عمل جاری رکھا۔

''کسی نے ماجد کی لاش کو چھوا تو نہیں؟'' میں نے باری باری سب کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

رفیق عرف فیکا نے جواب دیا۔ ''نہیں تھانے دار صاحب! میں نے جب سے ماجد کی لاش کو دریافت کیا ہے، ادھر ہی موقع پر موجود ہوں۔ کسی نے بھی لاش کو ہاتھ نہیں لگایا۔''

''ایک مرے ہوئے آدمی کے جسم کا تو خوف ہی بہت زیادہ ہوتا ہے تھانے دار صاحب۔'' اللہ رکھا نامی ایک شخص نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔ ''اسے چھونے کی ہمت کون کرے گا۔''

جمیل نامی ایک بڈھے بابے نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''جیسی کرنی، ویسی بھرنی...... اس بدبخت نے مشتاقے کی عزت کے ساتھ کھلواڑ کیا تھا۔ اس کا یہی حشر نشر ہونا تھا......!''

''چاچا جمیل! تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجائی جا سکتی۔'' نواز تیلی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اس کام میں مشتاقے کی کڑی بھی شامل تھی۔ ماجد اگر بدبخت ہے تو پینو بھی کسی منہ کالک سے کم نہیں۔ ماجد، پینو کو زبردستی اغوا کر کے نہیں لے گیا تھا بلکہ وہ اپنی رضامندی سے ماجد کے ساتھ گھر سے بھاگی تھی۔ ان دونوں نے مل کر مشتاقے اور خالدہ کی عزت کا فالودہ بنایا ہے......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر بڑے کڑوے لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''سیانے سچ کہہ گئے ہیں...... اولاد کو سونے کا نوالہ کھلاؤ مگر شیر کی نظر سے دیکھو۔ میں سمجھتا ہوں، یہ جو کچھ بھی ہوا ہے اس میں مشتاقا بھی برابر کا شریک ہے۔ اولاد کی محبت میں اتنا بھی اندھا نہیں ہو جانا چاہیے کہ انسان کو اس کے کچھن بھی دکھائی نہ دیں۔ مشتاقے نے تو پینو کو بے لگام چھوڑا ہوا تھا۔''

''تم لوگ آپس کی بحث بازی بند کرو تو میں بھی تھوڑا سا کارِ سرکار کر کے اپنی روزی حلال کر لوں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

وہ یکدم خاموشی اختیار کر کے میری جانب متوجہ ہو گئے۔ اس دوران میں کانسٹیبل جنید بے ہوش بندے کو تانگے پر لاد کر ..... ڈسٹرکٹ اسپتال روانہ ہو چکا تھا۔ میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ماجد اپنے اچھے یا برے انجام کو پہنچ چکا۔ تم میں سے کوئی جانتا ہے کہ ماجد کی موت میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟''

سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ان میں سے کسی کے پاس بھی میرے اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ نواز تیلی نے بڑے تیکھے انداز میں کہا۔

''تھانے دار صاحب! میں یہ تو نہیں جانتا کہ ماجد کو کس نے موت کے گھاٹ اتارا ہے البتہ اس بات کا مجھے یقین ہے کہ اس کی موت میں مشتاقے کا کوئی ہاتھ نہیں۔''

''اور تمہارے اس یقین کی وجہ؟'' میں نے نواز تیلی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''وہ جناب...... اتنی جرأت دکھانے کے لیے انسان کا غیرت مند ہونا بہت ضروری ہے۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''اگر مشتاق کی عزت زندہ ہوتی تو معاملہ یہاں تک بڑھنا ہی نہیں تھا۔ ایک ایسے پردیسی کو اس نے اپنا کرائے دار بنا رکھا تھا جس کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا اور پینو کا بھی ماجد سے کھلم کھلا میل جول تھا۔ یہ چاند تو ایک دن چڑھنا ہی تھا سرکار......!''

مشتاق سائیکلوں والا ان لوگوں میں مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شاید اس لیے بھی مشتاق کے غیاب میں نواز تیلی کچھ زیادہ ہی بڑھ چڑھ کر بول رہا تھا۔ اس کے نکیلے اور زہر میں بجھے ہوئے جملوں سے مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ اپنے دل میں مشتاق کے لیے ناپسندیدگی کے جذبات رکھتا تھا۔ اس قسم کی باتیں تو پینو کی ماں خالدہ نے بھی مجھ سے کی تھیں کہ مشتاق کے بے جا لاڈ پیار نے پینو کا دماغ خراب کر رکھا تھا، وہ حد سے زیادہ ضدی، سرکش اور خودسر ہو گئی تھی لیکن نواز تیلی کا اندازِ تنقید مخاصمانہ تھا۔

''نواز......'' میں نے اسے گھیرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''ماشاء اللہ! تمہارا تجربہ اور مشاہدہ خاصا وسیع ہے۔ تمہارے خیال میں پینو اس وقت کہاں ہوگی؟''

''مجھے کیا پتا جی......؟'' وہ جلدی سے بولا۔

''میں نے کب کہا کہ تم اس کے مقام سے واقف ہو۔'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ''میں تو تمہارا خیال جاننا چاہ رہا تھا۔''

''جناب! سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ ماجد کی لاش چمن آباد کے کھیتوں میں پڑی ملی ہے۔'' وہ اظہارِ خیال کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کا مطلب یہی ہے کہ پچھلی رات ماجد کو ادھر ہی کہیں قتل کر کے اس کی لاش کو کھیتوں میں پھینک دیا گیا تھا اور...... پینو چونکہ ماجد کے ساتھ بھاگی تھی اس لیے اسے بھی چمن آباد یا اس کے آس پاس کہیں ہونا چاہیے......''

''تمہاری بات میں وزن ہے نواز۔'' میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم قانون کے ساتھ تعاون کرو......''

''کس قسم کا تعاون تھانے دار صاحب؟'' اس نے حیرت آمیز الجھن سے میری طرف دیکھا۔ ''آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''

میں نواز تیلی کو ایک طرف لے گیا۔ ''تم اپنے خیال کو ایک طرف رکھو اور ایک دو بندوں کو ساتھ رکھ کر چمن آباد اور اس کے گرد و نواح میں پینو کو تلاش کرنے کی کوشش کرو۔'' میں نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن کام بہت ہوشیاری اور رازداری کے ساتھ کرنا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا......؟''

''چنگی طراں سمجھ گیا تھانے دار صاحب!'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ''مجھ پر اعتماد کرنے کا شکریہ۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں کسی کو اس معاملے کی کانوں کان خبر نہیں ہونے دوں گا۔''

''شاباش!'' میں نے ستائشی انداز میں کہا۔ ''تمہاری اس خفیہ تحقیق کا جو بھی نتیجہ برآمد ہو، اس کی رپورٹ تم نے تھانے آ کر میرے سامنے پیش کرنا ہے۔''

''اوکے سرکار!'' وہ بڑے اسٹائل سے بولا۔ ''میں آپ کی توقع پر پورا اترنے کی پوری کوشش کروں گا۔ انشاء اللہ......!''

میں نے مزید دس منٹ جائے وقوعہ کی رسمی کارروائی میں گزارے پھر سرکاری اسپتال کی جانب روانہ ہو گیا۔ میں نے نواز تیلی کے ذمے جو کام لگایا تھا، اس کی اپنی جگہ ایک اہمیت تھی مگر ان لمحات میں میری نگاہ اس بے ہوش بندے پر ٹکی ہوئی تھی جسے میں نے کانسٹیبل جنید خان کی نگرانی میں بغرضِ علاج معالجہ کھیتوں سے اٹھوا کر ڈسٹرکٹ اسپتال بھجوایا تھا۔ اگر اس بندے کی آنکھ اور زبان کھل جاتی تو اس کیس کے مختلف دروازوں پر لگے ہوئے تالے خود بخود کھل جاتے تھے......!

☆☆☆

ڈاکٹروں کی انتھک محنت و توجہ اور ادویہ کے جادو اثر عمل نے کام دکھایا اور سہ پہر چار بجے کے قریب اس بندے نے آنکھ کھول دی۔ لگ بھگ چھ بجے وہ بیان دینے کے قابل ہو گیا۔ اسے حالتِ بے ہوشی سے عالمِ ہوش میں لانے میں اسپتال کی کارکردگی کے علاوہ میری دعاؤں کا اثر بھی شامل تھا۔ اس کیس کو حل کرنے کے لیے ایک وہی شخص میری امید کا ذریعہ تھا۔

وہ بندہ قدیر ہی تھا۔ اس نے خود کو زمانے بھر کی نظروں سے چھپا کر رکھنے کے لیے اپنا علاقہ چھوڑنے کے ساتھ ہی ایک نقلی شخصیت بھی تخلیق کر لی تھی۔ اگرچہ ماجد نامی ایک انسان جیتا جاگتا چک بیالیس شرقی میں موجود تھا لیکن بہرحال وہ ماجد نہیں بلکہ قدیر سن آف رمضان علی تھا۔ قدیر

نے جو ابتدائی بیان دیا اس کا خلاصہ میں اسی کی زبانی آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

''پینو مجھے بہت اچھی لگتی تھی اور وہ بھی مجھ میں گہری دلچسپی لینے لگی تھی مگر یہ سوچ کر کہ میں نہ صرف شادی شدہ بلکہ ایک بچے کا باپ بھی ہوں، پینو نے مجھ سے ایک خاص فاصلہ رکھا ہوا تھا۔ ہمارے بیچ تعلقات آگے بڑھتے رہے اور پھر ایک ایسا وقت بھی آیا جب میں نے محسوس کیا کہ میں پینو کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا چنانچہ اس کی محبت سے مجبور ہوکر میں نے اسے اپنی اصلیت سے آگاہ کردیا۔

''یہ سب سن کر پینو بہت خوش ہوئی اور وہ ہر حال میں مجھے اپنانے کے لیے تیار تھی لیکن اس کے ساتھ ہی پینو نے اس خدشے کا اظہار بھی کیا کہ اگر اس کے والدین کو پتا چلا کہ میں ماجد نہیں، قدیر ہوں اور میں نے انہیں اپنے بارے میں جو کچھ بھی بتایا وہ سب جھوٹ ہے تو وہ شادی کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ ایک اندیشہ پینو کو یہ بھی تھا کہ اگر اس کے ماں باپ نے چک بیالیس شرقی جاکر قدیر کے بارے میں پوچھ پرتیت کی تو یہ راز چھپا نہیں رہ سکے گا کہ قدیر کی ماں دماغی مریضہ تھی اور اسی بیماری میں اس کی موت واقع ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں چک بیالیس شرقی میں قدیر کی یعنی میری ریپوٹیشن بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ وہاں بسنے والا کوئی بھی آدمی میری حمایت میں زبان نہ کھولتا کیونکہ میں نے کبھی کسی سے بنا کر رکھی ہی نہیں تھی لہٰذا ہم دونوں نے مل کر یہی فیصلہ کیا کہ گھر سے بھاگ کر ہم کسی اور علاقے کی طرف نکل جاتے ہیں اور ایک نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔

''میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا یہ فیصلہ غلط تھا لیکن اس کے سوا ہمارے پاس اور کوئی چارۂ کار بھی نہیں تھا۔ سو، ہم نے سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ایک قدم اٹھالیا مگر پھر سب کچھ الٹا ہوگیا......''

''کیا الٹا ہوگیا؟'' میں نے سوال و جواب کا سیشن شروع کرتے ہوئے قدیر سے پوچھا۔

''ہم دونوں جی ٹی روڈ کے کنارے، بڑے مزے سے آگے بڑھ رہے تھے کہ اچانک کسی نے میرے عقب میں آکر میرے منہ پر ایک کپڑا رکھ دیا۔'' اس نے بتایا۔ ''عقب میں ہونے کے باعث میں اس منحوس شخص کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ بس اتنا یاد ہے کہ وہ کوئی تنومند اور سخت جان شخص تھا جس نے اتنے زور سے میرے منہ پر کپڑا دبا رکھا تھا کہ مجھے سانس لینے میں دشواری محسوس ہورہی تھی۔ اس کپڑے میں سے ایک عجیب سی ناگوار بدبو بھی آرہی تھی۔

اس گینڈے نے مجھے زیادہ سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں دیا۔ ان لمحات میں، میں پینو کے لیے بہت فکرمند تھا مگر میری بے بسی نے مجھے کچھ کرنے نہیں دیا اور میں دیکھتے ہی دیکھتے دنیا ومافیہا سے بے خبر ہوگیا......''

بولتے بولتے قدیر کی سانس پھول گئی اور وہ دھیرے دھیرے کھانسنے لگا۔ میں نے اسے پانی پلایا اور اس کے دوبارہ بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

یہ جس دور کا واقعہ ہے اس زمانے میں گوجرانوالہ کے قلب سے گزرنے والی جی ٹی روڈ سنسان اور غیر آباد ہوا کرتی تھی۔ کہیں کہیں کوئی فیکٹری اور بیچ میں خالی پلاٹس یا پھر تاحدِ نگاہ سرسبز وشاداب کھیتوں کا لامحدود سلسلہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قدیر کو پیش آنے والے واقعے کا کسی نے نوٹس نہیں لیا تھا۔

''جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک تاریک کمرے میں بے دست وپا پایا۔'' وہ خود پر ٹوٹنے والی بپتا کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میرے ہاتھ پاؤں اور کمر کو ایک چارپائی کے ساتھ کس کر باندھ دیا گیا تھا۔ پھر ایک موٹا تازہ، ننگ دھڑنگ، سیاہ بدن اور سرخ آنکھوں والا ٹھنگنا سا بدشکل بندہ میرے پاس آیا اور اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے خوفناک انداز میں کہا۔

''میرا نام گلزار ہے۔ میں پینو کا عاشق ہوں۔ تمہاری یہ مجال کہ میری معشوقہ کو بھگا لے جاؤ۔ میں تمہارا حشر نشر کرکے رکھ دوں گا......''

''پینو کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ اس پر گلزار نامی کوئی جن عاشق ہے لیکن میں نے اس کی بات کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا تھا لیکن گلزار کو اپنے سامنے دیکھ کر میری روح فنا ہوگئی۔ اس کے توے کے مانند سیاہ بدن پر صرف ایک لنگوٹ تھا اور اس کی سرخ آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ میں اس کی غضب ناکی کو محسوس کرکے سہم گیا تھا تاہم پھر بھی میں نے جی کڑا کرکے اس سے پوچھ ہی لیا۔

''گلزار بھائی! میری پینو کہاں ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ آپ کو اللہ کا واسطہ...... آپ ہمارے درمیان سے ہٹ جائیں۔''

''میری منت سماجت کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ طیش کے عالم میں بولا۔ ''بیچ میں، میں نہیں آیا بلکہ تم آئے ہو۔ میں تو بچپن ہی سے اس پر عاشق ہوں۔ وہ صرف اور صرف میری ہے۔ اگر تم دوبارہ اپنی زبان پر اس کا نام لائے تو میں تمہاری ہڈی پسلی ایک کردوں گا۔

شرافت کے ساتھ پینو سے دستبردار ہو جاؤ گے تو میں تمہیں اٹھا کر کسی دور دراز علاقے میں پھینک آؤں گا لیکن اگر تم اپنی ضد پر قائم رہے تو پھر اس کمرے سے تمہاری لاش ہی باہر جائے گی۔"

"تھانے دار صاحب! اگرچہ میں اس گلزار نامی جن سے ڈر گیا تھا لیکن پینو کی محبت نے مجھے بہت سہارا دیا اور میں نے گلزار کے سامنے گھٹنے ٹیکنے سے انکار کر دیا۔ وہ مجھے کھانے پینے کے لیے بہت کم دیتا تھا اور ہر بار آکر ایک ہی بات کرتا تھا...... پینو کا خیال اپنے دل سے نکال دو، اگر تمہیں زندگی عزیز ہے تو......! جناب پینو کے بغیر تو میں جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، میں اس کے خیال سے کیسے باز آ جاتا۔ میں بھی ہر تکلیف اٹھا کر اپنی ضد پر قائم رہا پھر پچھلی رات جب گلزار میرے پاس آیا تو اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"تم کتے کی دم ہو۔ میں نے تمہیں جان بچانے کے لیے جو مہلت دی تھی وہ تم نے اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ضائع کر دی۔ اب موت ہی تمہارا مقدر ہے...... مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ......!"

"پھر وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے میری گردن دبانے لگا۔ میرے ہاتھ پاؤں اور کمر چارپائی کے ساتھ بندھی ہوئی تھی لہٰذا میں اس نامراد جن کے جبر کے سامنے کوئی مزاحمت نہ کر سکا اور وہ گلا دبا کر مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش میں مصروف رہا۔ اسی دوران میں، میں کب ہوش و حواس سے بیگانہ ہوا، مجھے کوئی خبر نہیں۔ ابھی اسپتال میں میری آنکھ کھلی ہے تو پتا چلا ہے کہ میں زندہ ہوں......"

"جب تک تم اس نام نہاد گلزار نامی جن کے قبضے میں رہے، پینو کہاں تھی؟" اس کی داستان کے اختتام پر میں نے ایک اہم سوال کیا۔

"میں پینو کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" وہ بے بسی سے بولا۔

میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "لیکن میں اس کے بارے میں سب کچھ جان گیا ہوں۔"

اس نے امید بھری نظر سے میری طرف دیکھا اور لجاجت بھرے لہجے میں بولا۔ "تھانے دار صاحب! خدا کے لیے میری پینو کو بچالیں۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"پینو سب سے پہلے مشتاق اور خالدہ کی ہے۔" میں نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔ "تم فی الحال ادھر اسپتال ہی میں آرام کرو۔ میں پینو کو بچانے جا رہا ہوں۔ تم سے میں بعد میں آکر بات کرتا ہوں......"

وہ تشکرانہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کانسٹیبل جنید خان کی قدیر کے ساتھ ڈیوٹی لگائی، اسپتال کے عملے کو خصوصی ہدایات دیں اور وہاں سے واپس آ گیا۔

☆☆☆

قدیر کی اسٹوری میں "گلزار" کی انٹری نے میرا کام آسان بنا دیا تھا۔ یہ فلیتہ نادر شاہ عرف شاہ جی ہی کا لگایا ہوا تھا کہ پینو پر گلزار نامی ایک جن عاشق ہے جس کو بھگانے کے لیے وہ پینو کو تین رات تک اس کے آستانے پر بلا کر کوئی خاص عمل کرنا چاہتا تھا۔ جب شاہ جی کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوئی تو اس نے دوسرا راستہ اختیار کر لیا تھا۔

میں نے اسی رات دو کانسٹیبل اور حوالدار فلک شیر کی مدد سے پیر فرتوت نادر شاہ کے آستانے پر چھاپا مارا اور شاہ جی کی ہوس کا شکار ہونے والی پینو کو زندہ سلامت برآمد کرا لیا۔ شاہ جی اور اس کے دست راست جلال کا میں نے جو حشر کیا اسے آپ تصور کی نگاہ سے دیکھنے اور محسوس کرنے کی کوشش کریں۔ اس سارے قبیح کھیل میں جلال نے اپنے حلیے میں خاصی ڈرامائی تبدیلی کر کے گلزار جن کا کردار ادا کیا تھا۔

میں نے پینو کو مشتاق سائیکلوں والے کے حوالے کرنے کے بعد سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "اولاد سے لاڈ پیار ضرور کرو مگر اسے بے لگام نہ چھوڑو۔"

وہ شرمندگی کے بوجھ سے زمین میں گڑا چلا جا رہا تھا۔ جھکی ہوئی گردن کے ساتھ اس نے مریل سی آواز میں جواب دیا۔ "جو آپ کا حکم......!"

"یہ بندہ قدیر برا انسان نہیں ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ "ان دونوں سے جو غلطی ہوئی، اسے معاف کر دینا۔ یہ تمہارے لیے ایک مثالی داماد اور پینو کے لیے ایک اچھا شوہر ثابت ہوگا۔ انہوں نے جو بھی کیا، وہ ایک دوسرے کی محبت میں کیا ہے، اگرچہ طریقۂ کار غلط تھا مگر ان کی محبت میں کوئی عیب نہیں ہے......!"

مشتاق کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ وہ گردن اٹھا کر خاموش اور تشکر آمیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ان آنسوؤں میں ندامت، خوشی، احسان مندی اور شکر کے رنگوں کی آمیزش تھی۔

میں نے اس کے آنسو پونچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور نگاہ جما کر اسے تکتا رہا۔ ایسے جذباتی مناظر بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں......!

(تحریر: حُسام بٹ)